شاہراہِ وحدتِ امت



صفدر بیگ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

❀❀❀ توجہ فرمائیں! ❀❀❀

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب............

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔
- متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

❀❀❀ تنبیہ ❀❀❀

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر
تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com

شاہراہِ وحدتِ اُمت

مصنف
صفدر بیگ

ملنے کا پتہ
ریاض برادرز
40-اردو بازار لاہور فون : 7224989

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اِس خدا اندیش کی تاریک رات
ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

نام ——— شاہراہِ وحدت اُمت

اشاعت ——— اول (ستمبر ۱۹۹۹ء)

ناشر ——— صفدر بیگ

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ لاہور

قیمت ——— 36 روپے

ملنے کے پتے :

○ ریاض برادرز
40۔ اردو بازار لاہور

○ قرآن اکیڈمی
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 03-5869501

فہرست

آغازِ کلام

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دورِ عروج کے بعد زوال کی طرف سفر کے آغاز میں ہی وحدتِ اُمت کے لئے کوششوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ سید جمال الدین افغانی سے لے کر مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا) اور الطاف حسین (حالی) ہوں یا علامہ اقبال سب کے نزدیک زوال سے نپٹنے اور اُمت کی عظمت رفتہ کا حصول وحدتِ اُمت میں مضمر تھا۔

پھر جیسے جیسے زوالِ اُمت کی تہہ گہری ہوتی گئی اُمت غلامی کی خوگر ہوتی چلی گئی اور وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ مزاج بھی بدلتے گئے۔ پھر نئے مزاج اور وقت کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے اہل خرد نے وحدتِ اُمت کے مسئلے پر سوچا اور اس ہدف کو پانے کے لئے اپنی تجاویز کبھی تو اشعار کی شکل میں اور کبھی تحریری شکل میں محفوظ کر دیں۔

اگرچہ بدلتے ہوئے حالات اور تمدن کو سامنے رکھتے ہوئے مسائل کا حل تلاش کرنا اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے لیکن جن مسائل کی بنیاد اور ہیت اسلام میں موجود ہو ان میں اجتہاد کرنا فساد کرنے کی مترادف ہو گا۔

وحدت اُمت کے مسئلے پر بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہوا اور وقت کے بہتے دریا نے ہمارے اہل دانش کا جو مزاج بنا دیا ہے اسی مزاج کے مطابق اس

مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ میرے نزدیک ان دانشوروں کا مقام جو اس مسئلے کے متعلق سوچ رہے ہیں یا جنھوں نے اب تک سوچا ایسے ہی ہے جیسے کانٹوں کے جھرمٹ میں چھپا گلاب کا پھول یا شہد کی مکھیوں کے چھتے میں چھپا شہد۔

اگر کانٹوں کی موجودگی میں خوشبو لینا چاہیں گے تو کانٹے دار خوشبو کا بھی امکان ہے اور جیسے آپ مکھیوں کی موجودگی میں شہد نکالنا چاہیں گے تو ڈنک زدہ شہد حاصل ہونے کا امکان بھی ہے۔

میرے نزدیک وحدتِ اُمت کے مقصد کے حصول کا راستہ آج بھی وہی ہے جو چودہ صدیوں پہلے قرار دیا گیا تھا۔ یعنی اگر مختلف رنگوں، قبیلوں اور زبانوں کے لوگوں کو آپس میں جوڑنا ہو تو ان سب لوگوں کو ایک مشترک مقصد دے دیں تو یہ سب لوگ آپس میں بنیان مرصوص بن جائیں گے اس تجویز کے حق میں دلیل دینے کی حاجت نہیں بلکہ غیر مسلم بھی آج تک اس نقشے کو مانتے ہیں۔ جو نقشہ حضور ﷺ نے دنیا کو دکھا دیا تھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

یہ اسی مشترک نظریئے کی برکت تھی کہ کوئی آزاد کردہ غلام ہو لیکن وہ کسی جہادی لشکر کا امیر بھی ہو اور اس کے حکم کی اطاعت بھی ہو۔

اس تمہید کے بعد میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آج بھی اگر اُمت مسلمہ اپنے مقصد (شہادت علی الناس) کو باہم مشترک جانے تو اس اُمت کی وحدت قائم ہو سکتی ہے۔

میری تجویز یہ ہے کہ چونکہ افغانستان میں اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے اور باقی پوری اُمت مسلمہ اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے یعنی پوری نوع انسانی تک دین کو پہنچانے کے لئے اگر افغانستان کے امیرالمومنین کو اپنا امیر تسلیم کر کے باہم مشترک مقصد کے لئے اُٹھ کھڑی ہو تو وحدتِ اُمت کا مسئلہ حل ہونے کے لئے اس اُمت کی راہ دیکھ رہا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارے آرزو

اسی خیال کو عام کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ آئندہ صفحات میں اس بات کو دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

تعارف

انسانی معاشرے میں جو مختلف مسائل پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو کام مشکل ہو' جس کام میں صبر آزما پہلو پائے جائیں اس کام کو ایک تصوراتی (Idealistic) کام سمجھ کر اور اس کی اہمیت کم جان کر اس کام سے گریز کیا جاتا ہے' اور نا سمجھی میں یا خود فریبی کا سا رویہ اختیار کرتے ہوئے اس مشکل کام کو آئیڈیلزم اور ریلزم کی بحث کے اندھے کنوئیں میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ کہہ کر اس اہم اور بنیادی کام سے جان چھڑا لی جاتی ہے کہ آئیڈیلزم الگ چیز ہے اور ریلزم الگ چیز ہے۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ ایک نظریاتی کتاب ہے اور بنیادی طور پر یہ کتاب ایک نظریہ ہی پیش کر رہی ہے۔ چونکہ نظریاتی کام میں بڑے مشکل مراحل پیش آسکتے ہیں اور دوسری طرف انسانی معاشرے میں جو مختلف مسائل پائے جاتے ہیں ان مسائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو کام ذرا مشکل ہو' جس کام میں صبر آزما پہلو پائے جائیں اس کام کو ایک نظریاتی اور تصوراتی کام سمجھ کر' اس کی اہمیت کم جان کر اس سے گریز کیا جاتا ہے چاہے وہ کام فرض کا درجہ رکھتا ہو اور نا سمجھی میں یا خود فریبی کا سا رویہ اختیار کرتے ہوئے اس مشکل کام کو نظریاتی (Idealism) اور حقیقی (Realism) کی بحث کے اندھے کنوئیں میں ڈال دیا جاتا ہے اور اس اہم اور بنیادی کام سے ہی جان چھڑالی جاتی ہے کہ آئیڈیلزم (Idealism) الگ چیز ہے اور ریئلزم (Realism) الگ چیز ہے۔

در حقیقت یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ ایک بات نہایت قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ریئلزم (Realism) کا جو اطلاقی پہلو ہے وہ بعض اوقات بال سے زیادہ باریک ہوتا ہے۔ جس کا مسئلے پر اطلاق کرتے وقت بسا اوقات ٹھوکر لگ سکتی ہے۔ اسی طرز فکر کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے' فرد' جماعتیں' ادارے اور تنظیمیں ربع صدی کا عرصہ گزارنے کے باوجود یوں محسوس کرتی ہیں کہ سفر کا آغاز تو ابھی ہوا ہی نہیں۔ مثال کے طور پر ایک بہت بڑی متحرک دینی جماعت کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے جو کہ اسی ریئلزم (Realism) کے اطلاقی پہلو کو نہ سمجھنے کے

نتیجے میں سامنے آیا ہے۔ مذکورہ دینی جماعت کی بات کچھ یوں تھی کہ اس کے مؤسس اور قائد نے وقتی حالات کے ساتھ سازگاری کرتے ہوئے اپنی انقلابی جماعت کی تشکیل جمہوری طرز پر ڈھال دی۔ چنانچہ بعدازاں اس جماعت کو مختلف اوقات میں بڑے بڑے فکری اور سیاسی جھٹکے لگتے رہے اور آخر ۱۹۵۶ء میں ایسا عظیم حادثہ پیش آگیا کہ جماعت کی سیکنڈ لائن کی قیادت جماعت سے علیحدہ ہو گئی۔ لیکن بعد میں جماعت کے بانی کا ذہن ان کی تحریر سے کھل کر واضح ہو گیا کہ ایک جمہوری طرزِ فکر کی جماعت کے مقابلہ میں ایک انقلابی طرز کی جماعت کی تشکیل بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ ان دونوں کا نظم بالکل الگ الگ ہوتا ہے لیکن ریئلزم (Realism) کے اس بال سے باریک پہلو کا اس وقت ٹھیک اطلاق نہ کرنے کی صورت میں جماعت کو ناقابل تلافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ میرے نزدیک ہر وہ دلیل جو معقول ہو اور اپنے نظریہ کی طرف جانے کے لئے ضروری ہو وہی حقیقت پسندی ہے۔ اور وہی ریئلزم ہے۔ اہل دانش اور صاحب الرائے حضرات تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ راستہ چاہے کتنا ہی لمبا ہو اور اس سفر کے لئے ذرائع چاہے کتنے ہی سست رفتار ہوں لیکن اگر سفر کی سمت درست ہو تو سفر اختیار کر لینا چاہیئے لیکن اس کے برعکس اگر سفر کی سمت درست نہ ہو اور سفر کے لئے چاہے کتنے ہی عمدہ' تیز رفتار ذرائع موجود ہوں تو پھر بھی سفر اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔

حقیقت میں اپنے مقصود (Ideal) کی طرف دلیل سے بڑھتے رہنا ہی حقیقت پسندی (Realism) ہے جبکہ وقت کی بھول بھلیوں میں کھو جانا اکثر

لوگوں کا انداز رہا ہے لیکن خود زمانہ بھی انہیں ہستیوں کو یاد رکھتا ہے جو اپنے آئیڈیل کو پانے کے لئے مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے' دکھ برداشت کرتے ہوئے' زمانے کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ یہی زمانہ ہم کو آج تک وہ منظر بھی دکھا رہا ہے جب آنحضور ﷺ مکے کی گلیوں میں تنہا اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے چند ساتھیوں کو خوشخبری دے رہے تھے کہ ایک دن آ کر رہے گا جب اللہ کا دین اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم ہو گا لیکن دوسری طرف بعض ایسے کم ہمت بھی تھے جو آپؐ کو مشورہ دے رہے تھے کہ معاملہ کچھ لے دے کر طے کر لینا چاہیئے۔ آخر کیسے ممکن ہے کہ مکہ المکرمہ کے اس طرح کے مضبوط نظام میں آپؐ کی پوری بات مان لی جائے لیکن ثابت ہوا کہ اگر مقصود سامنے ہو اور دلیل مضبوط ہو اور سمت درست ہو تو بالآخر وہ وقت آ کر رہتا ہے جب تاریخ میں ایسے شخص کی کہانی سنہرے الفاظ میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ آخر کارل مارکس محض اپنا نظریہ پیش کر کے بیٹھ تو نہیں گیا تھا۔ اپنے اس نصب العین (Ideal) تک پہنچنے کے لئے اس نے جو بھی میسر ذرائع ممکن الحصول تھے انہیں استعمال کیا۔ اس جدوجہد میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب اس کا بیمار بیٹا دوا سے محروم زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا مگر اس نے اپنے بیمار بچے کی دوا لانے کی بجائے اپنے آئیڈیل کی اشاعت کے لئے اپنی جمع شدہ پونجی خرچ کر دی۔ بالآخر زمانے نے انقلاب کی طرف سفر کرتے ہوئے اور مصائب جھیلنے کے نتیجے میں مارکسزم کی شکل میں ایک انقلاب دیکھ لیا۔ (یہ بحث اپنی جگہ الگ ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا یا صحیح) قابل غور بات یہ ہے کہ جس رخ پر ایک نظریہ لے کر لوگ نکلے اس راستے پر دکھ اُٹھاتے ہوئے

بغیر کسی مفاہمت کے اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کی بجائے انقلابی راہ پر آگے بڑھتے رہے اور زمانے کو بتا دیا کہ مجنوں وہ نہیں ہیں بلکہ زمانے کے کم ہمت لوگ ہیں۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب دنیا نے دیکھا کہ کوئی باآوازِ بلند پکار رہا تھا۔

مجھ کو اِک زہر کا چھلکا ہوا ساگر دے دو
مجھ کو اِس دَور کے انسان پر ہنسی آئی

جب سقراط سے کہا گیا کہ یا تو تم اپنے نظریات کو پھیلانا چھوڑ دو گرنہ زہر کا پیالہ گلے میں انڈیل لو۔ اس شخص نے زہر کا پیالہ پی لیا مگر اپنے نظریہ سے بے وفائی اختیار نہ کی۔

عرضِ ما

ہر مقرر اپنی بات بیان کرتے وقت سامعین کو مخاطب کر کے یہ جملہ بڑی عاجزی سے بولتا ہے کہ میرے نکتہ نظر سے آپ کو اختلاف کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔" میرے خیال میں صرف اتنی بات کہہ دینا ہی کافی نہیں کسی بات میں سے اختلافی پہلو تو کوئی بچہ بھی نکال سکتا ہے بلکہ حکمت اور دانائی کی بات یہ ہے کہ اگر کسی نظریہ سے اختلاف کے بعد اگر عمومی فائدہ ۵% ہو اور نقصان ۹۵% تو ایسے اختلاف سے گریز کرنا ہو گا اور اس کے برعکس فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہو تو جس شخص سے اختلاف کیا جا رہا ہو اسے اپنے نظریے پر نظر ثانی کرنی چاہیئے اس طرح ممکن ہے کہ اختلافی پہلو غیر اہم ہوتے جائیں اور صحیح بات عام سے عام تر ہوتی چلی جائے۔

میں اس کتاب کے قاری کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اس نظریئے کو سمجھنے کا حق ادا کیا جائے۔ حق ادا کرنے سے مراد یہ ہے کہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی بات سامنے آتی ہے تو قاری اس بات کو اپنے معنی پہنا کر اس کی خامیاں اور کوتاہیاں بیان کرنے میں ہی وقت صرف کر دیتا ہے۔ نتیجتاً جس بات پر نئی بحث چل نکلتی ہے وہ لکھنے والے کی بات ہوتی ہی نہیں۔ اس طرح کسی نظریئے کو سمجھنے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ایسا رویہ جان بوجھ کر اختیار کیا جاتا ہے اور ناسمجھی میں بھی۔ لہٰذا ایسے طرز عمل کی اصلاح ممکن ہو سکتی ہے کیونکہ اکثر لکھنے والے قادر الکلام نہیں ہوتے اس لئے کوئی نہ کوئی پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔ صحیح طرز فکر یہ ہے کہ قاری کو مصنف کی جس بات سے اختلاف ہو وہ وسعت قلبی کا ثبوت دے کہ شاید میرے سمجھنے میں ہی غلطی ہو، لکھنے والے کو اپنی بات کی وضاحت کا موقع دے۔ اگر قاری یہ نیا سلسلہ شروع کر سکے تو یہ ایک اچھی اور طالب علمانہ روش ہو گی اور اس کے لئے میں بھی اپنے اوپر لازم سمجھتا ہوں کہ کسی قاری کا معاملہ میری دسترس کی حد تک ہو تو میں خود اس کے پاس حاضر ہو کر اپنے نظریہ کی وضاحت کر سکوں۔ اس طرزِ عمل سے دونوں جانب خیر ہی کے پہلو نکلتے ہیں۔ اگر معترض کی بات مجھے قائل کر سکے تو میں اپنے نظریہ پر اصرار نہیں کروں گا۔ دوسری جانب اگر میں معترض کو اپنی بات کی وضاحت کر کے قائل کر لوں تو بھی خیر ہی خیر ہے اس معنی میں کہ بات طول نہیں پکڑے گی۔ لیکن اس کے باوجود اگر معترض کنندہ کو اطمینان نہ ہو سکے تو پھر وہ جو چاہے رویہ اختیار کرے۔ طالب علمانہ انداز سے کی گئی افہام و تفہیم کے ذریعے فریقین پر بات واضح ہو جانے

کے بعد اگر کوئی اپنے ضمیر کے خلاف لکھے گا تو اس کا قلم بھی تو اسے ملامت کرے گا۔ ویسے بھی کسی نظریئے کو سمجھنے اور سمجھانے کا حق اسی طرح ہی ادا ہو سکتا ہے۔

ایک جملہ عام طور پر آپ کے سننے میں آتا رہتا ہے اور ہر مقرر اپنی بات بیان کرتے وقت سامعین سے مخاطب ہو کر یہ جملہ بڑی عاجزی سے بولتا ہے کہ "میرے نکتہ نظر سے اختلاف کرنے کا آپ کو پورا حق حاصل ہے۔" صرف اتنی بات کہہ دینا ہی کافی نہیں کسی سے اختلاف برائے اختلاف کرنا کوئی عالمانہ کام نہیں۔ کسی بات سے اختلافی پہلو تو کوئی بچہ بھی ڈھونڈ سکتا ہے۔ جیسے کسی مصور نے ایک تصویر بنا کر اس پر یہ جملہ لکھا کہ اس تصویر کے نقائص بتائیے۔ تصویر کو چوراہے پر لٹکا دیا گیا اگلے دن دیکھا گیا تو اس پر بے شمار اعتراضات کئے گئے تھے۔ مصور نے پھر وہی تصویر بنائی اور اس پر لکھا کہ اس تصویر کی اصلاح کیجئے۔ اس دن کسی نے اس کی اصلاح کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اسی طرح کسی عظیم مقصد کو سامنے رکھنے کے بعد اگر کوئی جزوی اختلاف پیدا ہو جائے اور یقیناً اختلاف پیدا ہو گا تو اس اختلاف کو اس معیار پر پرکھنا چاہیئے کہ :

اگر اختلاف کرنے کا پانچ فیصد (5%) عمومی فائدہ ہو اور پچانوے فیصد (۹۵%) نقصان ہو تو حکمت اور دانائی کا تقاضا ہے کہ ایسے اختلاف سے پرہیز کیا جائے اور اگر اس کے برعکس اختلاف سے فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہو تو دوسرے شخص کو کہ جس کے نظریئے سے اختلاف کیا گیا ہے اسے اپنے نظریئے کے بارے میں نظر ثانی کرنی چاہیئے۔ اس طرح ممکن ہے کہ اختلافی پہلو غیر اہم ہوتے جائیں اور صحیح بات عام سے عام تر ہوتی جائے۔

مدعا

ع یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

کے مصداق اللہ تعالٰی نے پوری اُمت مسلمہ میں سے سرزمین افغانستان کو اپنے دین کے غلبے کے لئے نقطہ آغاز کی حیثیت سے چن لیا ہے۔ لہٰذا پوری اُمت مسلمہ پر فرض ہے کہ افغانستان کے امیرالمومنین کو اپنا امیر تسلیم کر کے ایک امیر کی قیادت میں جمع ہو کر اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لئے اُٹھ کھڑی ہو۔

ایک وقت تھا جب اُمت مسلمہ اپنا فرضِ منصبی یعنی شہادت علی الناس بطریق احسن ادا کر رہی تھی۔ ایک مرکزی ادارۂ خلافت پوری اُمت کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کر رہا تھا۔ لیکن زوالِ اُمت کے ساتھ ساتھ یہ مرکزی ادارہ بھی ختم ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ پوری اُمت مختلف جغرافیائی حدبندیوں یعنی ملکوں اور ریاستوں کی صورت میں تقسیم ہو گئی۔ شہادت علی الناس کی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے اسلامی تحریکوں کا آغاز ہوا تاکہ کسی ایک ملک میں اسلام کا عادلانہ نظام قائم ہو سکے اور دوسری طرف پوری اُمت کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا ہو سکے۔ چنانچہ ع "یہ رتبہ بلند ملا جس کو ملا گیا" کے مصداق اللہ تعالیٰ نے پوری اُمت میں سے افغانستان کی سر زمین کو چن لیا ہے۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ "پوری امت پر فرض ہے کہ افغانستان کے امیرالمومنین کو اپنا امیر مان کر اپنے فرض یعنی شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لئے اٹھ کھڑی ہو۔" اس پس منظر میں افغانستان کے امیرالمومنین پر کیا ذمہ داری آتی ہے اس کا ذکر آئندہ صفحات میں ہو گا۔

دعویٰ کی شرعی حیثیت

قرآن حکیم ہم کو بعض ایسے اجتماعی احکامات دیتا ہے کہ اگر موجودہ ممالک کی حدود کا نظام قائم رہے تو قیامت تک بھی ان احکام کو پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً سورۃ الحجرات کی آیت ۹ میں فرمایا کہ اے مسلمانو!

"اگر دو مسلمانوں کے گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کرادو۔ پھر اگر ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرتا جارہا ہو تو اس زیادتی کرنے والے گروہ کے خلاف جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے پھر اگر (ظالم گروہ) اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے تو ان کے مابین صلح کردادو عدل کے ساتھ اور انصاف کرو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

اگر دو مسلم ممالک آپس میں محاذ آرائی اختیار کرلیں تو آپ کس اختیار کے تحت کسی ایک ظالم ملک کے خلاف لڑیں گے اور اسے اپنی کس حیثیت کے پیش نظر مجبور کریں گے کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ جبکہ آیت کا منشا کچھ یوں ہے کہ جیسے ظلم سے روکنے والے فریق کے پیچھے بہت بڑی طاقت ہو اور وہ طاقت ہے پوری اُمت مسلمہ کا یکجا ہونا ایک امیر کے ساتھ۔ احادیث کے مجموعے پر غور کرنے سے بھی آدمی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اُمت کا امیر ایک ہی ہونا چاہیئے جیسا کہ حدیث میں فرمایا:

((اِذَا بُوْیِعَ لِخَلِیْفَتَیْنِ فَاقْتُلُوْا الْاٰخَرَ))

"جب بھی دو خلفاء کی بیعت ہو تو ان میں سے دوسرے کو (جس کی بیعت بعد میں کی گئی ہو) قتل کردو۔"

سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ اور سورہ حج کی آیت ۷۸ کی رو سے اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی "شہادت علی الناس" ہے۔

"اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اُمت وسط بنایا تاکہ تم سب لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائے۔" (البقرہ : ۱۴۳)

"تاکہ رسول گواہ ہو جائے تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ تمام لوگوں پر"۔ (الحج : ۷۸)

شہادت علی الناس کا مفہوم اور تشریح

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب شہادت علی الناس کا مفہوم اور تشریح اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ :

﴿ لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾

"تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کے گواہ بنو اور رسول تمہارے اوپر اللہ کے دین کا گواہ بنے۔"

یہ اُمت وسط کا فرضِ منصبی اور اس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے۔ اوپر کی تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو رہنمائی کے منصب پر مامور کیا تھا انہوں نے خدا کے میثاق کو توڑ دیا۔ اس کی شریعت میں تبدیلیاں کر دیں' اس کی صراط مستقیم گم کر دی' اس کے مقرر کئے ہوئے قبلہ سے منحرف ہو گئے اور جن شہادتوں کے وہ امین بنائے گئے تھے ان کو انہوں نے چھپایا۔ ایسے حالات میں عالم انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی اُمت

برپا کرے جو خدا کی سیدھی راہ پر قائم ہو' جو اللہ کے رسول ؐ کے ذریعہ سے اصل دین کی حامل بنے اور پھر رہتی دنیا تک لوگوں کے سامنے اس دین کی گواہی دے۔

"رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔" سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علی الناس کا جو فرض آنحضرت ﷺ پر بحیثیت رسول کے تھا۔ آپؐ کے بعد آپؐ کی اُمت کی طرف منتقل ہوا اور اب یہ اس اُمت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور' ہر ملک اور ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے' اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتائج بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہو گی۔

ہمارے ارباب تاویل نے عام طور پر اس شہادت کو آخرت سے متعلق مانا ہے کہ یہ اُمت گمراہوں کے خلاف انبیاء کی تائید میں آخرت میں شہادت دے گی کہ ان گمراہوں کو اللہ کا دین پہنچ چکا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے گمراہی کی یہ روش اختیار کی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص و تحدید کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس اُمت کو شہداء اللہ ہونے کا یہ مرتبہ آخرت میں بھی حاصل ہو گا۔ لیکن آخرت میں یہ مرتبہ اسی وجہ سے حاصل ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اس کو اس منصب پر سرفراز فرمایا ہے جو اُمت اس دنیا میں دین حق کی گواہ ہے۔ ظاہر ہے کہ وہی آخرت میں بھی اس پوزیشن میں ہو گی کہ گواہی دے کہ لوگوں کو اللہ کا دین ٹھیک پہنچا یا نہیں؟

مسلمانوں کا فرضِ منصبی

یہی فریضۂ رسالت ہے جس کی وجہ سے اس اُمت کو "خیر اُمت" کہا گیا

ہے۔ اگر مسلمان اس فرض منصبی کو بھلا دیں تو یہ دنیا کی قوموں میں سے بس ایک قوم ہیں نہ ان کے اندر کوئی خاص خوبی ہے' نہ کوئی خاص وجہ فضیلت اور نہ پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پروا ہے کہ وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلت کے ساتھ۔ بلکہ اس فرض کو فراموش کر دینے کے بعد وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں جو خدا کی طرف سے کسی منصب پر سرفراز کی گئی تھیں' اپنا فرض انجام نہ دینے کی وجہ سے معتوب ہو گئیں۔ چنانچہ جس آیت میں مسلمانوں کے "خیر اُمت" ہونے کا ذکر ہے اسی میں ان کی ذمہ داریاں بھی واضح کر دی گئی ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ (آل عمران ۱۱۰)

"تم بہتر اُمت ہو' لوگوں کی رہنمائی کے لئے مبعوث کئے گئے ہو' معروف کا حکم دیتے ہو' منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اسی جماعتی فرض کو ادا کرنے کی باضابطہ صورت خود اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی یہ ہے:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (آل عمران ۳:۱۰۷)

"اور چاہیئے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے' معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک ٹھیک نبوت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ نیکی کی دعوت، معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا جو مسلمانوں نے اس لئے قائم کیا کہ اس جماعتی فرض کو انجام دے سکیں جو آنحضرت ﷺ کے بعد اس اُمت کو حق پر استوار رکھنے اور دنیا کو حق کی دعوت دینے کے لئے اس اُمت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اور اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور مسلمانوں کے باہر بھی انجام دیتا رہا ہر مسلمان اس فرض سے سبکدوش رہا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس وقت تک تبلیغ کا فرض ایک فرض کفایہ تھا اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر جماعت کے تمام افرا کو اس فرض کی ذمہ داری سے عنداللہ بری کر دیتا تھا۔ لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہو گیا تو جس طرح کسی ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے باشندوں کے جان و مال کی ذمہ داری خود ان کے اوپر منتقل ہو جاتی ہے اور جب تک وہ از سرنو اپنے نظام سیاسی کو درست نہ کرلیں ان میں ہر شخص اپنی حفاظت کا بوجھ خود اٹھاتا ہے اسی طرح نظام خلافت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اب یہ فریضۂ شہادت علی الناس اس اُمت کے تمام افراد پر منتقل ہو گیا ہے اور جب تک وہ اس کو انجام دینے کے لئے اس صالح اسلامی نظام کو قائم نہ کر دیں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس وقت تک اس فریضہ کے ادا نہ ہونے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور قیامت کے دن اس کی پرسش ہر شخص سے ہو گی۔

خلاصۂ بحث

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے :

(ا) آنحضرت ﷺ پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لئے تبلیغ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی کریم ﷺ نے رہنمائی فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی اُمت کے سپرد فرمایا تاکہ یہ اُمت ہر ملک' ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

(ب) اس تبلیغ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے' زبان سے کی جائے' عمل سے کی جائے' بلا تقسیم و تفریق' پورے دین کی کی جائے' بے خوف لومتہ لائم اور بے رو رعایت کی جائے اور اگر ضرورت داعی ہو تو جان دے کر کی جائے۔

(ج) اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

(د) اس ادارہ کے منتشر ہو جانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری اُمت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہو گئی۔

(ہ) اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لئے باقی رہ گئی ہیں یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

(و) اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرضِ رسالت کو ادا

نہ کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لئے اصل محرک درحقیقت اس فرض عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور اس میں جو چیز بطور مطمع نظر اس وقت پیش نظر رکھنی ہے وہ یہ نظام دعوت خیر پھر وجود میں آ جائے جو خلق کو اللہ کے دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمام حجت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہے ہر مسلمان کا سب سے مقدم اور سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لئے جو کچھ کر سکتا ہے کرے۔ اس کے لئے ہر مسلمان کو سونا اور جاگنا چاہیئے' اسی کے لئے کھانا اور پینا چاہیئے اور اسی کے لئے مرنا اور جینا چاہیئے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی خدا کے منشا کے بالکل خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اپنی اس کوتاہی کے لئے کوئی عذر پیش نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ان کی ہستی کی غایت ہے۔ اگر اس کو انہوں نے کھو دیا تو جس طرح وہ تمام چیزیں جو اپنے مقصد وجود کو کھو کر کوڑے کرکٹ میں شامل ہو جاتی ہیں اسی طرح یہ بھی اس زمین کی خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے لئے یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اُمت وسط یا "خیر اُمت" کے لقب کا مستحق سمجھیں یا اللہ تعالیٰ سے کسی نصرت و حمایت کی امید رکھیں۔

(مولانا کی وضاحت ختم)

ان آیات کی تشریح سے یہ بات ثابت ہوئی کہ رسول ﷺ نے ایک اُمت تک دین کو پہنچا کر ان پر دین کی گواہی ثبت کر دی۔ اب اُمت کا فرض

ہے کہ وہ پوری نوع انسانی تک دین کو پہنچائے جس طرح اگر کوئی رسول دین کو لوگوں تک نہ پہنچاتا تو اللہ کے حضور اس بات کا جواب دہ ہوتا۔ اسی طرح اگر اُمت لوگوں تک دین کو نہیں پہنچاتی تو پوری اُمت گنہگار ہوگی۔ اُمت مسلمہ ' جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ اپنی ذمہ داری بڑے احسن طریقے سے ادا کر رہی تھی۔ لیکن زوالِ اُمت کے ساتھ ساتھ وہ ادارۂ خلافت بھی ختم ہو گیا جو پوری اُمت مسلمہ کی طرف سے فرض کفایہ کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔ یہاں ایک اصولی بات سامنے آئی ہے وہ یہ کہ جب کسی گروہ پر کوئی ذمہ داری ڈالی جائے پھر اگر وہ گروہ اپنی اجتماعی ذمہ داری ادا نہیں کرتا تو اس گروہ میں شامل تمام افراد پر وہ ذمہ داری فرداً فرداً آ جاتی ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی ادارے نے ۵۰ آدمیوں کے ذمہ ایک کام سونپا اب کچھ دیر تو وہ پچاس آدمیوں کا گروہ اپنے فرائض ادا کرتا رہا اور ادارے کی طرف سے ۵۰ میں سے ہر ایک اپنے اپنے درجہ کے مطابق خوب القابات اور انعامات بھی وصول کرتا رہا اسی طرح اب مقصد پورا نہ کرنے کی صورت میں ہر ایک جواب دہ نہ ہوگا؟

اسی مثال کو ایک دوسرے پہلو سے اُمت مسلمہ کے اس عظیم گروہ پر منطبق کیجئے جو کہ پچاس ممالک پر محیط پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے کہ اگر اب تک سب ممالک اپنی عظیم متاع گمشدہ (شہادت علی الناس) کے لئے سرگرداں تھے تو ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اگر کسی ایک ملک کو وہ ہیرا (شہادت علی الناس) پکڑا دیا ہے تو یہ چونکہ پوری اُمت کی گمشدہ متاع ہے اس لئے پوری اُمت مسلمہ کو لپک کر اس گمشدہ متاع کو حاصل کرنا چاہیئے

اگرچہ وہ گروہ (افغانستان) فی الحال ابھی تک غیر ترقی یافتہ ملک ہی ہے تب بھی پوری اُمت مسلمہ کی گمشدہ متاع انہوں نے ڈھونڈ لی ہے۔ اس لئے اب اُمت مسلمہ پر اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے افغانستان کے امیر کی امارت کو تسلیم کر کے کمربستہ ہو جانا ضروری ہے بلکہ فرض ہے تاکہ اُمت مسلمہ کا ایک مرکز وجود میں آئے اور باقی پوری اُمت کی طرف سے فرض کفایہ کی شکل بن سکے۔

فرضِ کفایہ

فرض کفایہ کا مفہوم تو اکثر لوگوں کو معلوم ہے لیکن اس لفظ کا اطلاق کرتے وقت بہت ہی غلط باتیں بھی کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی دینی جماعت کوئی اچھا کام کر رہی ہوتی ہے یا کوئی ادارہ کوئی کام کر رہا ہوتا ہے تو ہم بڑی فراخ دلی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ادارہ تو پوری اُمت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات اپنی بنیاد کے اعتبار سے غلط ہے۔ یعنی آپ کی طرف سے تو فرضِ کفایہ اس وقت ادا ہو گا جب آپ اس ادارے کے ساتھ منسلک ہوں گے خواہ کسی قسم کا جانی و مالی تعاون ہی کر رہے ہوں گے اسی صورت میں آپ کہہ سکیں گے کہ فلاں ادارہ میری طرف سے بھی فرض کفایہ ادا کر رہا ہے۔ اسی طرح جب پاکستان نے ایٹم بم بنالیا تو کئی اسلامی ممالک نے جوش میں آکر کہہ دیا کہ یہ ایٹم بم پوری اُمت مسلمہ کی طرف سے فرض کفایہ کا درجہ رکھتا ہے۔ حالانکہ یہ تو بڑی دور کی بات ہے کہ کسی مسلم ملک کے ظلم کا نشانہ بن جانے کے جواب میں پاکستان کی طرف سے اس مظلوم ملک کے حق میں کسی ایٹم بم کی دھمکی بھی دوسرے ظلم کرنے والے ملک کو

مل جائے بلکہ پاکستان اس صورت حال کو معمول کے حالات سمجھ کر دوسرے مظلوم مسلم ملک کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دے گا۔

اب آیئے اصل مسئلے کی طرف کہ آج کل کچھ علماء حضرات بھی اسی طرح کی بات افغانستان کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ افغانستان میں اب اسلامی نظام قائم ہو گیا ہے تو یہ پوری اُمت کی طرف سے فرضِ کفایہ کا درجہ رکھتا ہے۔ حالانکہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ پوری اُمت نے جس طرح افغانستان سے لاتعلقی کا رویہ اختیار کیا ہوا ہے اس کی بنیاد پر اُمت مسلمہ کس منہ سے کہہ سکتی ہے کہ یہ ہماری طرف سے فرض کفایہ ادا ہو رہا ہے۔ خلافت راشدہ کا دور اس سے بالکل مختلف تھا اس وقت چاہے اُمت مسلمہ کا حدود اربعہ لاکھوں مربع میلوں پر محیط تھا لیکن پوری اُمت کا امیر ایک ہی تھا اور اسی کی ایک حقیر مثال خلافت عثمانیہ کا وہ دور ہے جبکہ اُمت مسلمہ اگرچہ دینی لحاظ سے زبوں حالی کا شکار تھی لیکن وحدت اُمت کی ایک اساس تھی۔ اس لئے پوری اُمت کی طرف سے حقیقتاً اس وقت فرضِ کفایہ کی شکل بنی ہوئی تھی یعنی اس وقت پوری اُمت مسلمہ ایک ہی امیر کا حکم مانتی تھی لیکن آج افغانستان کی موجودہ صورت حال پوری اُمت مسلمہ کے لئے ویسی نہیں ہے۔ اس پوری بحث کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج اس وقت ان شاء اللہ وحدتِ اُمت کا مسئلہ حل ہونے کو آ گیا ہے۔ آج وقت ہے کہ اُمت مسلمہ افغانستان کے امیرالمومنین کو اپنا امیر مان کر اپنا فرض منصبی ادا کرے تا کہ پوری اُمت کی طرف سے فرض کفایہ کی شکل بن سکے۔

اس کے علاوہ جو بھی طریقے وحدتِ اُمت کے لئے تجویز کئے جائیں گے

وہ سب ناپائیدار ہوں گے۔ مثلاً اپنے اپنے ملک کی حدود کو قائم رکھتے ہوئے حکمران اپنی اپنی شخصی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اگر کوئی عارضی یا علاقائی اتحاد مسلم ممالک میں قائم کر بھی لیں تو وہ اسلام کی منشا اور مزاج کے خلاف ہو گا۔ اس لئے کہ قرآن مجید ہمیں بعض ایسے اجتماعی احکامات دیتا ہے کہ موجودہ حدود اگر قائم رہیں تو ان احکام کو پورا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ سورۃ الحجرات (آیت ۹) میں فرمایا گیا (اے مسلمانو! اگر کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو تم زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو یہاں تک کہ وہ سیدھی راہ پر آجائے اور اللہ کے احکام کی طرف لوٹ آئے)

اس حکم کا اطلاق آپ اپنے ملک ہی کی حد تک تو کر سکیں گے لیکن اگر دو مسلم ملک آپس میں محاذ آرائی اختیار کریں گے تو آپ کس اختیار کے تحت کسی ایک "ظالم" کے خلاف لڑیں گے اور اسے کس سیاسی حیثیت سے مجبور کریں گے کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے جب کہ آپ کی اپنی ابھی تک کوئی مطلوبہ حیثیت ہی نہیں جبکہ آیت قرآنی کا منشا کچھ اس طرح ہے کہ جیسے کسی ظلم سے روکنے والے فریق کے پیچھے ایک بڑی طاقت موجود ہے جو اس کو عدل کرنے پر مجبور کرے۔ یہ اس کیفیت سے نبٹنے کے لئے ایک امیر اور مامورین کا نظام ہی ہو سکتا ہے جب ایک امیر کے حکم پر پوری اُمت تعمیل کے لئے نکل کھڑی ہو۔

اس نظام کے خلاف موجودہ جغرافیائی حد بندیوں کے ہوتے ہوئے اگر آپ کسی مظلوم ملک کی دادرسی کے لئے نکل کھڑے ہوئے تو عین ممکن ہے کہ بعض ممالک آپ کے حریف ملک کے ساتھ مل کر خود آپ کا ہی ناطقہ بند

کر دیں اور یوں اصلاح کی بجائے اُمت مسلمہ میں ایک نیا فساد پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے سورۃ الحجرات (آیت : ۹) کا صد فی صد اطلاق اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک اُمت مسلمہ ایک ہی امیر کے تحت نہ آجائے۔ قرآن ہمیں جو احکامات دیتا ہے ان سب احکامات کی کڑیاں باہم پیوست ہوتی ہیں۔ ایسا ممکن نہیں کہ ایک حکم آپ کسی ثقافتی نظام یا رواج کا لے لیں اور دوسرا حکم آپ قرآن کا اپنا لیں۔ اس کے نتیجے میں فساد پیدا ہو جائے گا۔ ایک ہی مثال ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہو گی۔ وہ یہ کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں قحط پڑ گیا تو آپؓ نے (قطع ید) یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا کچھ عرصہ کے لئے منسوخ کر دی۔ کیونکہ درمیان والی کڑی جو کفالت عامہ کی تھی وہ ٹوٹ گئی تھی اس لئے حضرت عمرؓ کو دوسری کڑی خود توڑنی پڑی۔ وہ اس لئے کہ اسلامی حکومت ہر شہری کی خوراک کی فراہمی کی ذمہ داری لیتی ہے لہٰذا جب اسلامی حکومت کسی کی بنیادی ضرورت خوراک کی کمی پوری نہیں کر سکتی تو اس کو پھر (قطع ید) کی سزا دینے کا بھی کوئی حق نہیں رہتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اسلام نے ہمیں ایک امیر اور مامور والا نظام دیا ہے تو کیا اس کے علاوہ کوئی دوسرا نظام اپنا کر اُمت مسلمہ کامیاب ہو سکتی ہے؟ ایک اصولی بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ ہر نظام اپنے مزاج کی مطابق اپنے ماننے والوں کی نفسیات کی تشکیل کرتا ہے۔ اس دور کے مطابق اگر آپ اُمت مسلمہ کو یکجا کرنا چاہیں تو اس دور کی اجتماعی نفسیات بھی اتحاد میں در آئیں گی۔ آپ جب کسی دولتِ مشترکہ جیسا ادارہ بنائیں گے تو اس کا کوئی امیر بھی ضرور ہو گا اور اس ملک کو بڑا اسی لئے بنائیں گے کہ اس کے پاس ذرائع اور وسائل زیادہ

ہیں۔ لہٰذا یہی ذرائع اور وسائل کوئی دوسرا ملک جس کا عہدہ کم درجے کا ہو گا اگلے سال جمع کر کے خود بڑا بن جائے گا اور پھر یوں اس دوڑ میں باقی اتحادی ممالک بھی شامل ہو جائیں گے پھر آپس کی چپقلش کا جو نتیجہ نکلے گا۔ اس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کیونکہ یہ بات اس دور کی نفسیات میں شامل ہے ہر کوئی سوچتا ہے کہ ہماری بھی حیثیت ہے۔ اگر کوئی دوسرا صدر بن سکتا ہے تو میں بھی بن سکتا ہوں۔ گویا اس دور کے مطابق وحدت اُمت کا جو بھی نظام بنے گا لازماً اس دور کی نفسیات کے مطابق ہی ہو گا۔ جبکہ نظام بیعت اختیار کرنے والوں کی نفسیات پہلے نظام کے بالکل برعکس ہوں گی۔ نظام بیعت میں امیر کو اس طرح کی مشکلات کا سامنا نہیں ہوتا جو کسی بھی جمہوری طرز کے نظام میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نظام بیعت میں امیر اور مامور بالکل یکسوئی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرتے چلے جاتے ہیں۔ امیر کو یہ فکر دامن گیر نہیں رہتی کہ شاید آنے والی صبح اس کے لئے عدم اعتماد کی تحریک لے کر طلوع ہو گی اور پھر وہ انہیں چکروں میں رہے کہ اپنے نائبین کو کس طرح جائز اور ناجائز ہتھکنڈوں سے اپنے ساتھ جوڑے۔

ان سب فکر مندیوں سے پاک امیر اور مامور کا رشتہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دونوں کے کردار کے پیچھے ایک ہی جذبہ ہوتا ہے۔ امیر کو معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں نے اپنے ساتھیوں کی آراء اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ٹھیک فیصلہ نہ کیا تو عنداللہ مجرم قرار پاؤں گا اور دوسری طرف مامورین کی نفسیات یہ بن چکی ہوتی ہے کہ انہیں ہر وقت اور ہر مقام پر یہی فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ کہیں امیر کی اطاعت میں کوتاہی کے نتیجے میں عنداللہ مجرم قرار نہ

پائیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیش آنے والا واقعہ اس موقف کو بڑی خوبصورتی سے واضح کرتا ہے۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں اسلام کا حدود اربعہ بہت بڑھ گیا تھا اور فتوحات کا دائرہ بھی تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے حالات میں ایک محاذ جنگ جس پر مسلمان حضرت خالدؓ بن ولید کی امارت میں جہاد کر رہے تھے' حضرت عمرؓ نے اس محاذ پر پیغام بھجوایا اور حضرت خالدؓ کی جگہ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ کو امیر مقرر فرما دیا جو کہ حضرت خالدؓ ہی کی امارت میں لڑ رہے تھے۔

اس تبدیلی سے حالات ویسے کے ویسے ہی رہیں جیسے کہ پہلے تھے اور جس جوش اور جذبے کے ساتھ پہلے جہاد ہو رہا تھا اس کیفیت میں ذرا سی کمی کا نہ آنا' آج کا آدمی صرف تصور ہی کر سکتا ہے۔ حقیقت دیکھنے سے قاصر ہے لیکن واقعہ یہی ہے کہ یہ نقشہ کہیں فضا میں نہیں بنا تھا۔ اس زمین پر ہی تھا کتنا بڑا کریڈٹ ہے۔ اس نظام کو اور اس نظام کے تجویز کرنے والے کے حق میں کہ وہی شخص جو چند دن پہلے ایک لشکر کی کمان سنبھالے ہوئے تھا وہ چند لمحوں کے اندر اندر اسی محاذ پر ایک مامور اور عام سپاہی کی حیثیت سے لڑ رہا تھا اور کسی رنجش کا اظہار بھی نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی طوفان برپا کیا گیا کہ یہ تبدیلی کیوں کی گئی؟

اپنی بات کی دلیل کے حق میں مَیں چاہوں گا کہ ایسے دور سے ایک مزید مثال پیش کروں جو ہمارا بڑا ہی روشن دور تھا ان حالات کی مناسبت سے ہمارے سامنے ایک حدیث نبوی رہنی چاہیئے کہ جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ

ایک امیر کے ہوتے اگر کوئی دوسرا امیر بنے تو دوسرے کو قتل کردو۔

یہ حدیث بھی ایک اصولی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ کسی بھی ادارے کے دو امیر نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ کام کریں گے تو اس ادارے کی سلامتی کی گارنٹی کوئی شخص بھی نہیں دے سکتا چاہے وہ ادارہ کوئی بھی ہو۔ دورِ خلافت راشدہ میں دو حکومتیں وجود میں آگئی تھیں (حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی) تو ان کے مابین اسی لئے جنگیں ہوئیں۔ حضرت علیؓ کی طرف سے تو صاف بات ملتی ہے کہ انہوں نے اسی لئے حضرت معاویہؓ سے جنگ شروع کی کہ اُمت میں ایک ہی امیر ہونا چاہیئے اور لوگوں نے ان کو (حضرت علیؓ کو) خلیفہ بنایا تھا لہٰذا وہ خلیفہ کی حیثیت سے اطاعت کے مطالبہ میں حق بجانب تھے۔ اگر دو حکومتوں سے اُمت کے حق میں خیر ہوتی تو وہ لوگ کسی طرح کا نظام بنا کر دونوں حکومتیں چلاتے رہتے۔ آخر کیا حرج تھا؟

جیسا کہ ایک گھڑی ساز ادارہ گھڑی کے ساتھ ہدایات بھی لکھ کر بھیجتا ہے کہ اس گھڑی کو فلاں چیز سے بچا کر رکھنا، فلاں جگہ پر نہ رکھنا۔ اسی طرح جس ہستی کے ہاتھوں یہ اُمت مسلمہ تشکیل پذیر ہوتی اس نے ساتھ ہدایت بھی دے رکھی تھی کہ اس اُمت کے جب بھی دو امیر ہوں گے تو اُمت نقصان اٹھائے گی۔ اُمت میں ایک ہی امیر رہے گا تو برکت بھی ہوگی اور سربلندی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا عرصہ اُمت میں دو خلفاء دعوے دار رہے اُمت پستی میں ہی رہی اور ساتھ ہی کچھ دوسرے عناصر بھی شامل ہوگئے۔

بہرحال اب اس تصوراتی نظام کی طرف بڑھنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ جس ملک میں اسلامی نظام قائم ہو جائے تو پوری اُمت ایک جانب اس ملک کی

معاون بنے اور دوسری طرف اپنا مقصد (شہادت علی الناس) سامنے رکھتے ہوئے اس ملک کے سربراہ کو اپنا امیر تسلیم کرلے۔ یہ کوئی بھی اسلامی ملک ہو سکتا ہے کیونکہ کئی ایک مسلم ممالک میں دین کو قائم کرنے کے لئے جماعتیں برسرپیکار ہیں۔ لیکن ان سب میں سے اللہ نے افغانستان کو چن لیا ہے۔ لہٰذا منطقی طور پر اب باقی اُمت کو اپنا فرض پہچان کر اسلامی ریاست کے امیر کی اطاعت میں خود کو دے دینا چاہیئے۔ یہی سیدھا راستہ ہے یہی "شاہراہِ وحدتِ اُمت مسلمہ" ہے۔

علامہ اقبالؒ کی پکار

وحدتِ اُمت کے ضمن میں علامہ اقبال (مرحوم) کی یہ تجویز تھی کہ "فی الحال اُمت مسلمہ میں وہ آئیڈیل نظام تو موجود نہیں کہ جو ایک امیر اور ایک ہی اُمت پر مبنی ہو لیکن اگر کامن ویلتھ آف مسلم نیشنز جیسا اتحاد بھی وجود میں آجائے تو بھی غنیمت ہے۔"

علامہ اقبال (مرحوم) کی یہ خواہش محض کوئی مسلمانوں کا ادارہ وجود میں لانے کے لئے نہیں تھی بلکہ مقصود یہ تھا کہ کسی طرح اس آئیڈیل نظام کی طرف پیش رفت ہو۔

موجودہ حالات میں اقبال کی مذکورہ بالا تجویز کا علمبردار بننا مناسب نہیں کیونکہ اب واقعتاً وحدت اُمت کا مسئلہ حل ہونے کو آگیا ہے اور آج ممکن ہے کہ پوری اُمت افغانستان کے امیر کو اپنا امیر تسلیم کر کے اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے۔

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ جانوروں اور بھیڑ بکریوں کو جمع کرنے کے لئے ہاتھ میں ڈنڈا ہونا ضروری ہے لیکن اس کے برعکس انسانوں کو جمع کرنے کے لئے ڈنڈا نہیں بلکہ ان کے لئے ایک متفق علیہ نظریئے کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کو باہم جوڑ سکتا ہو! اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایک ہی نظریہ عطا فرمایا ہے یہ نظریۂ توحید کا نظریہ ہے۔ یعنی سب کا خالق ایک' سب کا روزی رساں ایک۔ جب پوری نوع انسانی کا پالنے والا ایک ہے تو اسی نظریہ پر پوری نوعِ انسانی جمع ہو سکتی ہے۔ چاہے کوئی کالا ہو یا گورا کسی بھی نسل سے تعلق رکھنے والا ہو۔ جب وہ توحید کو تسلیم کرلے گا تو لامحالہ اُمت واحدہ میں شامل ہو جائے گا۔ اس سے ایک درجہ نیچے اتر کر ہم اگر اُمت مسلمہ پر غور کریں تو یہاں بھی ہمیں یہی اصول دیا گیا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ سے ایک اُمت تشکیل پا گئی تو اس اُمت کو یکجا رکھنے اور اس کی سلامتی کے لئے بھی ایک مقصد عطا کیا گیا۔ پھر اس مقصد سے تعلق رکھنے والے سب ایک ہی گروہ میں شامل ہو گئے چاہے وہ ایرانی النسل تھے یا حبشی النسل سب ایک ہی اُمت کے فرد بن گئے۔ چنانچہ دنیا نے پھر یہ نقشہ بھی دیکھا کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
بندۂ و صاحب و غنی و محتاج ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

بہرحال اس قسم کے معاشرے کے حق میں بڑے بڑے مورخین نے اپنی

شہادتیں رقم کیں اور اقرار کیا کہ حقیقت میں اُن مواعظ پر پہلی بار ایک معاشرہ دیکھا گیا جن مواعظ کا کئی انسانوں نے ذکر کیا تھا۔ یہ درحقیقت اسی ایک ہم مقصدیت کا نتیجہ تھا جس سے قیصرو کسریٰ کی حکومتیں بھی دہل گئیں۔ بہرحال ہر کمالِ را زوال کے مصداق اگرچہ اس بلندی سے زوال کی طرف آنے میں انسان کی اپنی کمزوریاں بھی شامل ہیں۔ اس اُمت پر بھی ایک شب تاریک طاری ہونے لگی اور وہ اُمت جو دوسروں کو عدل و مساوات کا درس دینے آئی تھی' وہ اُمت جو دوسرون کو بندوں کی غلامی سے نجات دلانے آئی تھی' باہم دست و گریباں ہو گئی پھر جس طرح اُمت مسلمہ کے عروج کو مورخین نے اپنے اقوال میں نقل کیا اسی طرح اب ان کے سامنے اُمت مسلمہ کی ذلت و رسوائی کی تصویر بھی موجود ہے اور جس طرح وحدت اُمت کو لوگوں نے ایک مثالی شکل میں دیکھا اسی طرح اس وحدت کو پارہ پارہ بھی ہوتے دیکھا۔ اگرچہ یہ اُمت کے ٹکڑے اب مختلف ممالک کی صورت میں اپنی اپنی حدود میں محدود اور محصور ہیں اور وقتاً فوقتاً کسی ایک دو مزید مسلم ملک کی خبر آجاتی ہے کہ اب ایک مزید ملک آزاد ہو گیا ہے۔ لیکن حقیقت کی نگاہ رکھنے والے اب بھی اس صورت کو ایک انگلی کے مترادف سمجھتے ہیں کہ جس طرح کسی شکنجے سے ہاتھ کی ایک اکیلی انگلی آزاد ہوتی ہے اور اس کو توڑا مروڑا بھی جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان مسلم ممالک کی مثال ہے جن میں سے ہر ایک کو ظلم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور بنایا جا رہا ہے۔ کہنے کو تو ہر ملک آزاد بھی ہے اور بااختیار بھی لیکن ہر ایک مسلم ملک انگلی کی طرح الگ الگ ہے۔ اسی طرح ہر ملک کی الگ حدبندی کی وجہ سے انہی حالات میں پھر

نفسیات بنتی چلی گئیں ان علیحدہ جغرافیائی حدو کی ساتھ ساتھ اس قدر پختہ آہنی دیواریں بن گئیں یہ آہنی دیواریں عالم محسوسات کے دائرے سے باہر تھیں یہ نظریاتی دیواریں تھیں جو کہ اب تک چل رہی ہیں جس کے نتیجے میں سمجھ لیا گیا کہ کسی ملک میں پیدا ہونے والے شخص کے لئے بس صرف اتنا ضروری ہے کہ وہ اپنے وطن کے اندر ہی دین کا کام کرتے کرتے جان دے دے۔ دین کی خاطر اپنے ملک کو چھوڑنا اس وقت لازم ٹھہرا دیا گیا کہ جب دین کی دعوت کے لئے سارے راستے بند اور جان جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ بات جزوی طور پر درست ہو سکتی ہے لیکن اس کا دوسرا رخ ذہنوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ہجرت کا یہ پہلو نظروں سے اوجھل ہو گیا کہ اگر کسی دوسرے ملک میں اسلام کا غلبہ ہو جائے تو اپنے ملک کو چھوڑ کر اس ملک میں ہجرت کر جانا چاہیئے۔

ہم سورۃ العنکبوت کی (آیت : ۵۶) کی اصولی راہنما سے محروم ہو گئے ہیں جس میں اللہ نے فرمایا کہ "اے میرے بندو تم کو ہر حال میں صرف میری ہی عبادت کرنی چاہیے"۔ چونکہ دوسری جانب وطنیت کا نظریہ اس قدر زور آور بن چکا تھا (اور ہنوز یہ نظریہ پختہ ہوتا جا رہا ہے) کہ مسلمان بھی ناسمجھی میں اس وطن کی "پوجا" میں لگ گئے اور وطن کے آہنی خول کے اندر صرف اپنے وطن کے ترانے الاپنے لگے۔ ان حالات میں علامہ اقبال کا ظہور ہوا انہوں نے جس طرح وطن کے اس بت کو توڑنے کے لئے ہتھوڑے چلائے یہ اُنہی کا کام تھا۔ ان کی نگاہ دوربین تھی جس نے دیکھ لیا تھا کہ حقیقت میں یہی وطن کا تصور اُمت مسلمہ کے لئے زہر قاتل ہے۔ لیکن تاحال

اُمت مسلمہ اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بہرحال اگر کوئی راہنما چاہے تو علامہ کی نظم وطنیت سے راہنمائی حاصل کر سکتا ہے اور اُمت اگر اس کے مطابق کوئی لائحہ عمل اختیار کرے تو اس کا کھویا ہوا وقار دوبارہ لوٹ سکتا ہے۔

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گیر کا شانۂ دین نبوی ہے
بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی محمد ﷺ کی صداقت پہ گواہی
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ذرا غور فرمایئے کہ علامہ اقبال کس زہر آلود فکر سے اُمت مسلمہ کو آگاہ کر رہے ہیں۔ اُمت کو مخاطب کر کے فرما رہے ہیں کہ تیرا مقام یہ نہیں۔ اے مسلم تو نے کن زنجیروں میں خود کو جکڑ لیا۔ تم تو ہر وطن کی حدود سے بالاتر قوم ہو اور پھر جس طرح محبوب الٰہی کی سنت ترک وطن ہے تو بھی اس چیز کی گواہی میں ثابت کر دے کہ تیرا دیس صرف اسلام ہے۔ یہ وطنیت کا بت تو دور حاضر کا تراشا ہوا ہے اور حقیقت میں یہ وطن کا نظریہ اور اس میں قید ہو جانا یہ تو دین نبوی کے گھروندے کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ اس نظم کے آخری شعر اور یہاں ترتیب کے اعتبار سے چوتھا شعر اس میں تو بالکل

دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں علامہ فرما گئے کہ اس وطنیت کے نظریئے سے مخلوق خدا جمع نہیں ہو سکتی بلکہ اقوام میں بٹ جاتی ہے اور یہی چیز اسلام کی جڑ کاٹنے والی ہے کیونکہ اسلام تو درحقیقت اسی امتیاز کو ختم کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس قدر واضح انداز میں وطنیت کے اس چھپے مرض کو ظاہر کرنے کے باوجود اُمت مسلمہ میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا شائد اس لئے کہ ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

کے مصداق ہو سکتا ہے کہ یہ ملکی حدود ہی آگے چل کر اس وحدت اُمت کی شکل اختیار کر جائیں بالکل اس طرح کہ کسی ایک ملک میں پہلے اسلام کا نقشہ بن جائے پھر پوری اُمت اسی ملک کی اتباع میں لگ جائے۔ اسی خواہش کے ضمن میں علامہ اقبال کی ایک تجویز یہ تھی کہ فی الحال اُمت مسلمہ میں وہ آئیڈیل نظام تو موجود نہیں کہ جو ایک ہی امیر اور ایک ہی اُمت پر مبنی ہو لیکن اگر (کامن ویلتھ آف مسلم نیشنز) جیسا اتحاد بھی وجود میں آجائے تو بھی غنیمت ہے۔

علامہ اقبال کی یہ خواہش اور تجویز محض کوئی مسلمانوں کا ادارہ وجود میں لانے کے لئے نہیں تھی بلکہ مقصود یہ تھا کہ کسی طرح اس آئیڈیل نظام کی طرف پیش رفت ہو۔ اس لئے انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ اس تجویز کو اگر آج کل بھی پیش کیا جائے۔ یہ کہہ کر کہ وحدت اُمت کے ضمن میں علامہ اقبال کی تجویز تھی تو درحقیقت آج اس تجویز کے لئے وقت مناسب نہیں رہا بلکہ اس تجویز سے آگے بڑھ کر کسی نئی تجویز کی ضرورت ہے۔ یہ بات ایک

مثال سے خوب اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نہی عن المنکر کے تین درجے ہیں پہلا یہ کہ اگر کوئی شخص برائی کو دیکھے تو اسے چاہیئے کہ وہ اس برائی کو ہاتھ سے روکے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دوسرا درجہ ہے کہ اس برائی کو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو پھر تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس برائی کو دل سے برا جانے لیکن یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

اب اس حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی حکمران برائی کو بس دل سے ہی برا جان کر سمجھے کہ میں نے نہی عن المنکر کے درجے پر عمل کیا ہے تو یہ اس حکمران کی کم فہمی ہو گی کیونکہ دل سے برا جاننا تو اس وقت ہے جب استطاعت نہ ہو اور پھر اوپر آیئے زبان سے بھی اس وقت برائی کو روکا جائے گا جب اختیار نہ ہو لیکن اختیار بھی ہو پھر بھی دوسرے اور تیسرے درجے پر عمل کر کے سمجھا جائے کہ نہی عن المنکر کا حق ادا ہو گیا ہے۔ یہ حکم نبویؐ کی حکمت پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح اگر آج علامہ اقبال کی تجویز کا ورد کیا جائے اور صرف ایک مسلمانوں کی دولت مشترکہ جیسے ادارے کا ذکر کر دیا جائے تو میرے نزدیک یہ اُمت کی بدقسمتی کا شاہکار ہونے والی بات ہو گی کیونکہ اب مناسبت وقت آ گیا ہے کہ اُمت ایک امیر کے پیچھے جمع ہو جائے اس کے لئے حالات بھی سازگار ہیں۔

ایک بندۂ مومن کا اصل معیار اور پرکھ کسی ملک کے وسائل نہیں بلکہ وہاں پر رائج اسلام کا عادلانہ نظام ہونا چاہیئے۔ یہ وسائل تو ہر ملک ہی چاہے گا کہ میرے پاس زیادہ سے زیادہ آ جائیں۔ ان ذرائع اور وسائل کو الگ

رکھتے ہوئے جیسا کہ (نظم) وطنیت میں اس بات کی وضاحت ہو چکی ہے کہ مسلمان کو اگر کسی بت کی پوجا کرنی ہو تو وہ اسلام ہے جہاں اسلام دیکھے وہاں اپنے آپ کو موجود پائے۔ اگر اُمت مسلمہ کا معیار وسائل کے بجائے معیار بن جائے تو واقعتاً وحدت اُمت کا مسئلہ حل ہو جائے گا اگر اس اصولی بحث کو سامنے رکھا جائے تو بات یہی سامنے آئے گی کہ جس ملک میں اسلام کا عادلانہ نظام قائم ہو جائے پھر پوری اُمت اس کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی اصل وحدت کی طرف لوٹے۔ میں اپنی اس تجویز کو ملک کے دانش ور حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس مسئلہ پر کھل کر بات ہو اور اُمت کے سامنے ایک راستہ کھل سکے۔ اگر اس خیال میں بہتری ہے تو بھی اُمت اس بھلائی سے فائدہ اٹھائے اور اگر اس میں کوئی غلطی ہے تو بھی واضح ہو کر سامنے آ جائے۔ میرے نزدیک اگر مختلف انسانوں کو پھر سے جوڑنے کا آغاز کرنا ہو یا اس اُمت کو پھر سے وحدت کا رنگ دینا ہو تو ہم سب کو ایک مقصد کے تحت جمع ہونا پڑے گا۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ یہ مقصد کہاں پورا ہوتا نظر آ رہا ہے؟ وہی نقطہ وحدت ہو گا اس نقطہ کے اعتبار سے بھی حقیقت میں افغانستان کی سرزمین ہی بنتی ہے جہاں نفاذ اسلام کا آغاز ہو چکا ہے۔ شاید اللہ نے اس سرزمین کو چن لیا ہے باقی اُمت کو ﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ ﴾ کا رویہ اختیار کرتے ہوئے اس کام میں جلدی کرنی چاہیئے۔ دوسرے جو اس طریقہ سے ہٹ کر ممکنہ طریق ہائے وحدت اُمت ہیں۔ جیسا کہ مسلم دولت مشترکہ کا ذکر ہوا ہے تو اس معاملے میں ایک اصولی بات یاد رکھنی چاہیئے جس طرح کا نظم وجود میں آئے گا وہ اجتماعی مقصد کے حوالے سے نرم یا سخت ہو گا۔ یعنی

کسی نظم کی نرمی یا سختی کے لئے فیصلہ کن شئے اس اجتماعیت کا مقصد ہو گا۔
مثلاً فوج کا ڈسپلن سخت ہے وہ اس لئے کہ فوج کو اپنے دشمن کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے وہاں کوئی ڈھیلا ڈھالا نظم نہیں چل سکتا۔ اس کے برعکس خدمت خلق کی ادارے کا نظم اتنا سخت اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کے مقاصد میں کوئی ہنگامی پہلو شامل ہی نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ مقصد کے اعتبار سے نظم کا تعین کیا جائے گا۔ اس بحث کو سامنے رکھتے ہوئے میں اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اُمت مسلمہ کے لئے کوئی عام مغربی طرز کا نظم درکار نہ ہو گا کیونکہ اُن ممالک کا مقصد آپس میں میل ملاپ یا کاروبار کی آزادی بھی ہو سکتا ہے لیکن اُمت مسلمہ کا مقصد بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزاد کروانا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جنگ و جدال کے مراحل بھی لازماً پیش آئیں گے۔ کیونکہ انسانوں کو شیر کے پنجوں سے آزاد کروانا آسان ہو گا لیکن انسانوں کی غلامی سے آزاد کروانا بہت مشکل کام ہے اس کے لئے پھر نظم بھی ویسا ہی ٹائٹ ہو گا تو پھر ہی اُمت اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گی ورنہ اس کے علاوہ اگر کوئی جزوی سا فائدہ پیش نظر ہے تو پھر اسی فائدہ کو سامنے رکھتے ہوئے ڈھیلا ڈھالا نظم بھی بنا لیجئے۔ ان حقائق کے پیش نظر سب ممالک کا افغانستان کے امیر کو اپنا امیر مان لینا ان کے لئے آسان بات نہیں ہو گی۔ بڑی قربانی کی ضرورت ہو گی کئی لوگ تو اس بات کو مذاق سے اڑا دیں گے کچھ مشکلات کا ذکر کر دیں گے۔ کئی لوگ اس سوچ کو ہی غلط قرار دیں گے یہ سب اپنی جگہ لیکن (الاقرب فالاقرب) کے اصول کے تحت ناچیز مولف تمام اُمت کی دینی جماعتوں کو یہ مشورہ دینے کی جسارت کر رہا ہے کہ اُمت کو ایک پلیٹ

فارم پر جمع ہوتے دیر لگ جائے گی لیکن آپ جس دین کے غلبے کے لئے اپنے اپنے ممالک میں محنت کر رہے تھے وہ دین تو قائم ہو گیا وہ دینی جماعتیں تو کم از کم اس اسلامی ملک کی حمایت میں اپنی صلاحیتیں صرف کر دیں اور افغانستان کے امیر کی واقعتاً مدد کریں جیسا کہ اس کا حق ہے۔ مذکورہ دینی جماعتیں اگر اس لئے اس تعاون سے گریز کر رہی ہیں کہ ان کو اپنے اپنے ملکوں میں ہی دین کا عادلانہ نظام رائج کرنے کی محنت کرنی ہے تو یہاں ایک سوال انہیں ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ کیا انہیں ایک فی صد بھی یقین ہے کہ اللہ انہی کے ذریعے اور انہی کے ممالک میں اسلام کے غلبے کا آغاز فرمائے گا۔ یقیناً جواب نفی میں ہو گا تو پھر اب بھی وقت دور نہیں بلکہ موقع ہے کہ وہ امیرالمومنین افغانستان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنی زندگی ہی میں وہ موقع پا لیں کہ شاید اللہ انہیں کے ہاتھوں اسلام کا عالمی غلبہ کروا دے اور کیا عجب کہ (سابقون الاولون) کا رتبہ اب بھی ان کا انتظار کر رہا ہو ورنہ دوسری صورت میں عین ممکن ہے کہ اپنے ہی ممالک میں اسلام کا خواب دیکھتے دیکھتے آنکھیں بند ہو جائیں تو ڈر ہے کہ ہمیں رب کے ﴿ فِيمَ كُنْتُمْ ﴾ (النساء : ۹۷) کے کٹہرے میں کھڑا ہونا نہ پڑ جائے۔

اعوذ باللہ من ذالك

پاکستان کی نفسیات

خود انحصاری کے نہ ہونے کی وجہ سے ہر نئی آنے والی حکومت سابقہ حکومت کی پیروی میں اپنا قبلہ دوسروں کو ہی سمجھتی۔ ایسی نفسیات کا نتیجہ بالکل ظاہر ہے جو نکلنا چاہیئے تھا اور جو نکل رہا ہے۔ وہ یہ کہ اپوزیشن کی بات چاہے معقول اور ملکی مفاد میں بھی ہے تو بھی اس بات کو اس لئے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ یہ اپوزیشن کی بات ہے اور غیروں کی تجویز چاہے ملکی مفاد میں نہ بھی ہو تب بھی اس لئے مانی جاتی ہے کہ ان پر ہمارا انحصار ہے۔

کسی بھی معاشرہ کا اندازہ کرنا ہو یا اجتماعی طور پر کسی اچھائی یا برائی کی طرف اشارہ کرنا ہو تو اصولی اعتبار سے معاشرے کے ان لوگوں کا ذکر مقصود ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں معاشرے کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ اگرچہ ان لوگوں کی تعداد قلیل ہوتی ہے لیکن یہی طبقہ عوام کی سوچ کی تشکیل کرتا ہے اور ان پر اثرانداز ہوتا ہے جس طرح جسم میں دماغ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور پورا جسم اس ننھے سے حصے کے کنٹرول میں ہوتا ہے اور یہ دماغ ہی ہے جو جدھر چاہتا ہے جسم کو متحرک کر دیتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کا یہ طبقہ اپنی تعداد کے اعتبار سے اگرچہ کم ہوتا ہے لیکن معاشرے پر اثرانداز ہونے کے اعتبار سے اسے فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ طبقہ جس طرف چاہتا ہے عوام کے ریلے کو بہا کر لے جاتا ہے۔ سی طرح اگر کسی معاشرے کی مجموعی نفسیات کا جائزہ لینا ہو تو وہاں اس قسم کے لوگوں کی ذہنی کیفیات کا جاننا ضروری ہے۔ یعنی ان کے شب و روز کے معمولات کا جائزہ لینا ہوگا اور یہ کہ وہ کس بات کو مقدم اور کس کو موخر کرتے ہیں۔ یہ بات بھی بڑا وزن رکھتی ہے کہ اس کے نتیجے میں ان خال خال افراد کے کردار کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے وہ اپنی جگہ اہم ہیں لیکن کسی معاشرے کی اقدار کا جائزہ لینے کے لئے وہاں کی خال خال لوگوں کو معیار نہیں بنایا جا سکتا بلکہ ان افراد کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ جو معاشرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ گویا یہ خال خال افراد چنگاری کے مانند ہیں اور معاشرے پر اثرانداز ہونے والے طبقہ کی مثال آگ کی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ابلیس کی مجلس شوریٰ والی نظم میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا

ہے کہ اگرچہ مسلمان بحیثیت مجموعی مرچکا ہے اور اس کی غیرت و حمیت کا جنازہ نکل چکا ہے لیکن

خال خال اب تک اس قوم میں نظر آتے ہیں وہ

کرتے ہیں' اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

اسی طرح عین ممکن ہے کہ کسی قوم اور معاشرے میں ایسے باہمت افراد موجود ہوں جو اپنی ذات میں انجمن کی حیثیت رکھتے ہوں لیکن اصل حیثیت وہاں کے بااثر افراد ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس اصولی بحث کو سامنے رکھتے ہوئے ہم پاکستان کے لوگوں کی نفسیات کا جائزہ لیتے ہیں اس کے بعد ہی معاشرے کے بارے میں اچھی یا بری رائے رکھنے اور اسے پرکھنے میں آسانی ہو سکے گی۔ پاکستان کی آزادی کے پہلے دس یا پندرہ سال بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ یہ وقت قوموں اور ملکوں کی زندگی' ان کی سالمیت اور استحکام کے لئے کچھ فیصلے کرنے کے اعتبار سے نازک ہوتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کوئی قوم اپنی حیثیت متعین کرتی ہے۔ کسی ملک کے لوگوں میں آزادی کے فوراً بعد ایک جوش و خروش ہوتا ہے۔ یہی جذبہ آزادی کے حصول میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ جذبہ صادق ہو تو مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عقل کا ساتھ ایسے ہی ضروری ہے جیسے کسی نابینا شخص کے لئے چھڑی کا ہونا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ نابینا ہونے کے باوجود صحیح سمت اور مقام کا اندازہ کر سکے۔ چھڑی کے بغیر نابینا شخص کا کسی حادثے سے دوچار ہو جانا یقینی ہے۔ اسی طرح جوش و جذبے کے ساتھ اگر ہوش سے کام نہ لیا جائے تو افراد یا معاشرے کا تباہ ہونا یا غلط رخ پر پڑ جانا یقینی

بات ہے۔ روس میں انقلاب کے وقت روسیوں میں ایک جوش و خروش اور ولولہ موجود تھا جس کی مدد سے وہ لوگ کمیونسٹ انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن کمیونسٹ نظام کی بنیاد ہی میں ایک ایسی خرابی موجود تھی جسے عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری تھا۔ ایک وقت ایسا تھا کہ یہ انقلاب اپنے پورے عروج پر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اندر سے وہ کھوکھلا ہو رہا تھا۔ اور وہ وقت بھی آ گیا کہ جب یہ نظام اپنی ہی بنیادوں پر ڈھیر ہو گیا۔ کمیونسٹ نظام میں موجود یہ بنیادی خرابی اگر آغاز ہی میں عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دور کر لی جاتی تو یہ نظام تباہی سے دوچار ہونے کی بجائے نشوونما پاتا۔ خرابی یہ تھی کہ مارکسزم کے نظریئے کے مطابق کسی فرد کی ملکیت کی مکمل نفی کر کے سب کچھ حکومت اور پارٹی کے قبضہ و اختیار میں دے دیا گیا۔ حالانکہ فطری طور پر ہر انسان میں ملکیت کی خواہش موجود ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی ملکیت میں جو چیز ہو اس پر اس کی مرضی چلے' اسے اپنی خواہش کے مطابق رکھے اور سنوارے' اس کے لئے محنت کرے اور جو کام بھی وہ کرے اس کا فائدہ بھی حاصل کرے۔ لیکن کمیونسٹ نظام میں جب یہ طے کر دیا گیا کہ کسی شخص کی انفرادی ملکیت نہیں ہے چاہے وہ کتنی ہی محنت کرے' معاوضہ وہی معین ہو گا کہ جس سے صرف دو وقت کی روٹی اور دیگر ضروریات زندگی ہی میسر آ سکیں گی۔ جب انسان کی فطرت ہی مسخ کر دی جائے تو وہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے باوجود انسان جوش و جذبے کے تحت مشکل سے مشکل مراحل سے بھی گزر جاتا ہے۔ لیکن عقل کے بغیر اس کا انجام بالآخر وہی ہوتا ہے جو اس نابینا شخص کا ہوتا ہے جو کسی چھڑی کے سہارے کے بغیر چلنے کی

کوشش کرتا ہے۔

پاکستان کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ مارکسزم جیسا بھی برا بھلا فلسفہ حیات تھا اس فلسفے کی بنیاد پر بہرحال ایک ملک میں انقلاب تو آیا۔ پاکستان بھی ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کی بنیاد اسلام پر قائم ہوئی تھی لیکن ابھی تک یہ ریاست اپنے اس نظریئے پر اپنا نظم وضع نہیں کر سکی۔ اگر پاکستان میں ابتدائی زمانے ہی میں اپنے نظریاتی ہدف کو پانے کے لئے راستہ متعین کر لیا جاتا اور تقدیم و تاخیر کے مسئلہ کے تحت ترجیحات متعین کر لی جاتیں تو پھر آنے والے زمانے میں ان بنیادوں پر پاکستان کی تعمیر و تشکیل کے مراحل طے کئے جاتے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ پاکستان کو آغاز سے کچھ ایسے مسائل سے نبٹنا پڑا کہ نظریاتی پہلو کو اپنانے کی جانب نتیجہ خیز پیش رفت نہ ہو سکی اور جیسے کسی نوزائیدہ بچے کو شیر مادر کی ازحد ضرورت ہوتی ہے بالکل اسی طرح کسی نوزائیدہ مملکت کو بھی فوری امداد کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے فوری مسائل حل کر سکے۔ اگر وہ ملک اس مدد کو عارضی سہارا سمجھے اور ان وسائل کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا ذریعہ بنا لے تو ایسی امداد لینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر وہ اسی امداد ہی کو ابدی سہارا اور سب کچھ سمجھ لے تو نظریاتی طور پر وہ اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ اس طرز عمل کے اثرات آہستہ آہستہ ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے ایک بچے کی نفسیات اور اس کے تصورات اپنے والدین کے خیالات کے تحت بنتے ہیں۔ جب کوئی بچہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو اور وہ یہ دیکھے کہ والد صاحب رات کو نو بجے کام سے فارغ ہو کر گھر آتے ہیں۔ آتے ہی حالات کا رونا' غربت کا ذکر' نوکری کا اندیشہ ایسے حالات میں

جب بچے کی نفسیات پروان چڑھ رہی ہوتی ہے۔ وہ اس قسم کے خیالات اور رجحانات کا اثر قبول کرتا ہے اور بہت جلد وہ خود انہی چکروں میں پھنس جاتا ہے کہ میں نے اپنے والدین کا بوجھ اٹھانا ہے۔ گھریلو مسائل کو حل کرنا ہے۔ جیسے اس نے اپنے والدین کو دیکھا اسی کا عکس اس کی شخصیت اور طرز عمل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر بچے میں والدین کی خدمت کرنے کا جذبہ ابھرا ہے تو یہ کوئی بری چیز نہیں بلکہ قابل ستائش ہے لیکن اس طرز عمل کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس طرح بچے کو صرف پیسہ کمانے ہی کی لگن ہو گی خواہ کسی بھی طریقے سے کمائے اور اس کے علاوہ جو اخلاقی اقدار اور معاشرتی روایات ہیں نظروں سے اوجھل رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر گھر کے حالات اس قسم کے ہوں اور خود بنائے جائیں کہ جن سے یہ بات بچے کے ذہن نشین ہو کہ عزت کا معیار دولت اور مال و اسباب نہیں بلکہ انسان کے اچھے اخلاق اور بہترین کردار ہے۔ کسی کا حق نہ مارنا' لوگوں کی خدمت کرنا' اپنے گھر میں چاہے ایک وقت کا کھانا میسر ہو پھر بھی بچے کے ہاتھ کسی ضرورت مند کو اسی کھانے میں سے دے دینا بچے کو کسی کی چیز بغیر اجازت لینے سے منع کرنا یہ وہ طرزِ عمل ہے' یہی وہ ماحول ہے جو اگر بچے کو ملے گا تو بچے کا ذہن وسیع ہو گا اور صرف اپنی ذات کی بھلائی کی فکر سے آگے بڑھ کر' صرف والدین ہی نہیں بلکہ ہمسائے' گلی' اپنے شہر اور اپنے ملک کی فلاح و بہبود سے بھی آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کی خدمت کرنے کا جذبہ ابھرے گا اور پروان چڑھے گا۔

آج پاکستان بھی یہی ناگفتنی نفسیات لے کر جوان ہو چکا ہے۔ آغاز میں تو

پاکستان اپنی ضرورت کی بناء پر قرض لیتا رہا پھر اس کے بعد ہمارے حکمران کی ضرورت کی شکلیں بدلتی گئیں اور نقشہ وہ بن گیا کہ

قرض کی پیتے تھے مے اور کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اور پھر فطری طور پر جس شخص کا کوئی احسان ہو اس کی بات بھی رد نہیں کی جاتی اور پھر خود انحصاری کا پودا ہم نے لگایا ہی کب تھا جو جوان ہوتا اور پاکستان اس کا پھل کھاتا۔ اسی خود انحصاری کے نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے سیاست دانوں کی نظریں ہمیشہ دوسروں پر جمی رہیں۔ اس کی وجہ سے ہر آنے والی حکومت سابقہ حکومت کی پیروی میں اپنا قبلہ دوسروں کو ہی سمجھتی رہی۔ ایسی نفسیات کا نتیجہ بالکل ظاہر ہے جو نکلنا چاہیئے تھا اور جو نکل رہا ہے وہ یہ کہ اپوزیشن کی بات اگر معقول ہے اور وہ ملکی مفادات کے حق میں ہے تو بھی اس بات کو اس لئے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ یہ اپوزیشن کی بات ہے' غیروں کی تجویز چاہے ملکی مفاد میں نہ بھی ہو تب بھی اس لئے مانی جاتی ہے کہ ان پر ہمارا انحصار ہے اور پھر عوام کے منفی رد عمل اور ان کے اعتراضات سے بچنے کے لئے اپوزیشن کی بدکرداری کو نمایاں کرنا اور ممکن ہو سکے تو ناکردہ گناہوں کی سزا بھی انہیں دینا اور غیروں کے احسانات اور ان کی خوبیاں بیان کرنا ہر حکمران کی ضرورت ہی نہیں بلکہ ان کی مجبوری بن جاتی ہے تاکہ عوام کی بھی نفسیات ساتھ بنتی جائے اور پھر بڑے فخریہ انداز سے کہا جاتا ہے کہ پچھلی حکومت نے اگر چند کروڑ کا قرضہ لیا تھا تو ہم نے ان سے کئی گنا زیادہ قرض حاصل کر لیا ہے۔ اس بری نفسیات کا شکار اکثر و بیشتر عوام بھی ہوتے چلے گئے

اور عوام بھی انہیں مہربانوں کے گیت گانے لگے اور یوں

ع میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا

اب صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان کے ہر شہری کو گویا دو وقت کی روٹی کے عوض رہن رکھ دیا گیا ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی مجبوری کا اندازہ اس مثال سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ تقریباً ہر شخص کے بچپن میں ایسا واقعہ ہوا ہو گا کہ جب دو بچے آپس میں لڑ رہے ہوتے ہیں اور دونوں گتھم گتھا ہوتے ہیں مگر تھک کر چور ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے کہ اس طرح موقف کمزور پڑ جاتا ہے لہٰذا لڑائی جاری رہتی ہے کہ ایسے میں کسی بڑے کی ایک ہی آواز سے دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اب چاہے وہ دونوں کو ایک ایک تھپڑ لگا دے وہ برداشت کر لیا جائے گا لیکن آپس میں لڑائی کے وقت کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔ عرصۂ دراز سے پاکستان کے عوام اپنے سیاستدانوں کے اسی طرح کے طرز عمل کا شکار ہیں۔ یہاں تیسرا فریق یعنی امریکہ کسی کو بھی ایک تھپڑ رسید کر کے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ یہ مرض ہے جو آج پاکستان کو لاحق ہے۔

ملت کا درد رکھنے والے اہل وطن اپنے اپنے انداز سے پاکستان کو بچانے کے لئے مختلف تدابیر' تجاویز دیتے رہتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے نکتہ نظر کے مطابق اس مرض کا علاج تجویز کرتا ہے۔ بعض دانشوروں کے خیال میں اگر پاکستان کی حکومت اٹھ کھڑی ہو' بیرونی استعمار کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر کے کشکول توڑ دے تو پاکستان بچ سکتا ہے۔ لیکن حکومت میں اتنی جرأت کہاں کہ اپنے قرض خواہ کے سامنے سینہ سپر ہو سکے جن لوگوں کی سرشت ہی میں

ہاتھ پھیلانا ہو وہ ہاتھ اٹھا نہیں سکتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ ایک منزلہ مکان بنائیں اس کی بنیادیں بھی اسی کے مطابق ہوں اور پھر چند سالوں کے بعد اس پر تین مزید منزلیں تعمیر کرلیں ایسا کرنا تو صریح بے وقوفی ہوگی اگر آپ ایسا کریں گے تو جلد ہی آپ کو وہی مکان اس کا نتیجہ بتادے گا کیونکہ اس مکان کی بنیاد اتنا بوجھ سہارنے کے قابل نہ تھی۔ اسی طرح ہمارے جن سیاستدانوں کی نفسیات ہی بھیک مانگنا بن چکی ہے' ان کو اس طرح کا مشورہ دینا کہ تم بھیک دینے والوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاؤ۔ ایک منزلہ عمارت پر تین منزلہ عمارت تعمیر کرنے کے مترادف ہے۔

ایسے حکمرانوں سے کسی مثبت تبدیلی کی توقع رکھنا ہی عبث ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نہایت غیور اور باغیرت ہے وہ غیرت مندوں ہی کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ اپنے ملک کی حفاظت کرنے پر قادر نہیں ایسے لوگوں کو اپنے دین کی حفاظت کے لئے کیسے چن سکتا ہے؟ پاکستان کی موجودہ صورتحال کو بدلنے کا طریقہ وہی ہے جو زیر نظر کتاب کے شروع میں تجویز کیا گیا ہے۔

ع علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

بڑھاپے کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ عصا کا سہارا لیا جائے' اگر کوئی بوڑھا شخص چھلانگ لگا کر سیڑھیوں پر چڑھنا چاہے گا تو اپنی ہی ٹانگیں تڑوائے گا۔

ان لاینحل حالات سے نجات پانے کے لئے ساکنانِ پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہاں کے مقتدر طبقے کو افغانستان کے ساتھ الحاق کے لئے مجبور کریں' یہ الحاق بھی رسمی نہیں بلکہ ایسا الحاق مطلوب ہے کہ جیسا کہ اسلام میں اس الحاق کی بنیاد ملتی ہے تاکہ ایک طرف اپنے فرض کی ادائیگی ہو سکے دوسری طرف ہمیں آزادی اور غلامی میں فرق کا معیار معلوم ہو سکے۔

ان حالات میں اگر پاکستان کے حکمرانوں کے اذہان میں بھی اللہ ان کے فرض کی ادائیگی کا احساس ڈال دیتا ہے اور وحدتِ امت مسلمہ کے لئے بھی انہیں انشراح صدر حاصل ہو جاتا ہے تو پھر کسی لمحہ کی تاخیر کے بغیر ملا عمر کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسے اپنا امیر مان لیں اور فرض کی ادائیگی کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

یہ طریقہ اس طبقے کے لئے تجویز کیا جا رہا ہے جس کے دل میں اللہ شہادت علی الناس کے فریضے کی ادائیگی کا احساس ڈال دے اس کے برعکس ان لوگوں کے لئے نہیں کہ جو ابھی تک پہلے مختلف ممالک میں اسلام کا نظام برپا کر کے پھر آپس میں کوئی اتحاد بین المسلمین چاہتے ہیں بلکہ اس وقت تو اللہ تعالیٰ نے ایک "پنتھ دو کاج" جیسے حالات پیدا فرما دیئے ہیں۔ یعنی اگر آپ شہادت علی الناس کا فریضہ ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں گے تو تمام اسلامی ممالک میں اسلام کا نظام برپا ہو جائے گا۔ بالکل ایسے کہ جیسے آپ اگر کسی عضو کے سپیشلسٹ بننا چاہتے ہیں تو لازماً پہلے آپ کو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنا ہی ہو گا۔ لیکن آپ کے دل میں اگر صرف ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہی کی خواہش ہے تو آپ کی صلاحیتیں بھی صرف یہاں تک ہی محدود ہو کر رہ جائیں گی۔ اس وقت مسلم ممالک کے لئے اپنے اپنے ممالک میں دین کا نظام برپا کرنے کے مرحلے سے آگے بڑھ کر وحدت امت اور وحدت امیر کا مرحلہ آن پہنچا ہے۔ اگر ہم اصولی طور پر ایک امیر کی اطاعت کا عہد کر لیں گے تو اپنے ممالک میں نفاذ اسلام کا مرحلہ ایک ضمنی بات رہ جائے گی۔ ابھی یہ بحث اس بات کی متقاضی ہے کہ اس پر ارباب حل و عقد سر جوڑ کر بیٹھیں اور مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر لائحہ عمل مرتب کریں۔

صلاحیت کا مصرف

یاد رکھئے! کسی بھی ملک کو بامِ عروج تک پہنچانے کے لئے وہاں کے باہمت لوگ اور وہاں کا باصلاحیت ذہن ہی ہوتا ہے نہ کہ وہاں کی فیکٹریاں اور بڑی بڑی عمارتیں۔ یورپ کو ستاروں کی گذرگاہوں کا مسافر بنانے والا یہی باصلاحیت ذہن تھا۔ غور فرمایئے جب یورپ میں احیاء العلوم کی تحریک چلی تو اس کے پیچھے بھی وہی ذہن تھا جو غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے علم حاصل کرکے واپس اپنے گھروں میں آیا تھا وہاں اس طرح کا معاملہ تو نہیں تھا کہ غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں اور وہاں کے وسائل کو اکٹھا کرکے یورپ لایا گیا بلکہ یہ باصلاحیت ذہن اور باہمت لوگ تھے جنہوں نے پوری دنیا کو فتح کرلیا۔

غلامی اور آزادی کی زندگی میں ہر عاقل و باشعور انسان باآسانی فرق کر سکتا ہے۔ آزاد آدمی کی صلاحیتیں نکھرتی چلی جاتی ہیں اور غلامی میں آدمی کی ذہنیت محدود ہوتی جاتی ہے۔ صبح و شام کی محنت کا ہدف بس ظاہر میں نظر آنے والی ضروریات زندگی بن جاتی ہیں۔ اس طرح اندھیرے اور اجالے میں بھی ہر ذی شعور فرق کر سکتا ہے۔ کیا یہ صورتِ حال غلامی سے کسی درجے کم تر ہے کہ آدمی صبح سے لے کر شام تک محنت کر کے رات کو واپس گھر لوٹے تو اسے صرف اگلے دن کی فکر لاحق ہو کہ کس طرح اگلے روز بھوک مٹانے کا بندوبست کرنا ہے؟ کہتے ہیں کہ علم نیکی ہے اور جہالت بدی ہے۔ اس حکمت بھرے قول سے مراد شاید یہی ہے کہ علم سے آدمی اپنے بُرے بھلے کی تمیز کر سکتا ہے۔ فائدہ مند اور نقصان دہ چیز میں امتیاز کر سکتا ہے اور پھر فیصلہ کر سکتا ہے کہ مجھے اپنا قیمتی وقت کہاں صرف کرنا ہے لیکن دوسری طرف جاہل آدمی ان باتوں کو سوچنے سے بھی محروم ہوتا ہے اور وہ اس روشن خیالی اور دُوراندیشی سے کوسوں دُور ہوتا ہے۔ لیکن آج کے عالم اور جاہل آدمی میں یہ فرق تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس اعتبار سے دونوں کی دوڑ ایک ہی جانب ہے۔ انسان کا بلند مقصد ہونا' اعلیٰ خیال کا پایا جانا یہ ساری اقدار اب ختم ہو کر رہ گئیں ہیں۔ مادی چیزیں سب کے نزدیک مشترکہ طور پر نظر آئیں گی۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

ایک بوڑھا شخص جیسے بھی ممکن ہوا اس کا وقت گزر چکا ہے لیکن

بوڑھے شخص کی نسبت جوان آدمی کو یہ سوچنے کی زیادہ ضرورت ہے کہ اس کی زندگی ابھی باقی ہے۔ اس کی زندگی میں ابھی کئی دور آنے والے ہیں۔ قوت کار کی صلاحیت ہو تو آدمی بہتے دریا کا رخ بھی موڑ دیتا ہے اور پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسل کو اور اپنی اولاد کو کس قسم کا ماحول دے کر جا رہے ہیں۔ آیا ہم اسی طرح کا ماحول ان کی قسمت میں لکھ جائیں گے؟ اس بات پر اگر غور کریں گے تو ہر شخص اپنے بعد آنے والی نسل کا مجرم قرار پائے گا۔ کیا ہم اسی طرح کی زنجیروں میں ان کو جکڑ جائیں گے؟ جن میں ہم خود جکڑے ہوئے ہیں۔ محض دو وقت کی روٹی کے عوض۔ غلامی کی یہ زنجیریں ہم کو توڑنا ہوں گی ورنہ مجھے یقین ہے کہ اس دور کے کسی شخص کو جب قبر میں اتارا جاتا ہوگا تو علامہ اقبالؒ کی زبان میں قبر اس شخص کا لازماً ان الفاظ سے استقبال کرتی ہوگی کہ

آہ ظالم تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا
میں نہ سمجھتی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک

قبر کے اس طمانچے سے بچنے کے لئے اگر ارادہ پیدا ہو جائے کہ ہمیں غلامی کی نہیں بلکہ آزادی کی زندگی گزارنی ہے تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہمیں اپنا ذہن آزاد کرنا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں جہاں ہم کو دو وقت کی روٹی کی فکر نے غلام بنا کر رکھ دیا ہے وہاں ہمارے ذہنوں پر وطنیت کی زنجیریں ڈال دی گئی ہیں اور ہمارے ذہن کو وطن کا غلام بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے میں سب سے پہلی شرط ذہن کی آزادی کو قرار دیتا ہوں۔ یعنی ہمیں اس فکر کو ذہن سے کھرچ کر نکالنا ہوگا کہ ہم جس ملک میں پیدا ہوئے، جوان ہوئے بس اسی ملک

ہی میں ہمارا مرنا بھی ہو۔ یہ بات بوتل کے کارک کی حیثیت رکھتی ہے اگر اس کارک کو آپ نے کھول دیا تو سمجھیں کہ اب بوتل میں سے کچھ نکل بھی سکتا ہے اور اس بوتل میں آپ کچھ ڈال بھی سکتے ہیں۔

ذرا غور تو کیجئے کہ یہ کتنی کم ہمتی کی علامت ہے کہ ہمارے حکمران ہمارے ساتھ چاہے جس طرح کا رویہ روا رکھیں یہ طبقہ جس طرح چاہے ہم کو غلام بنا کر دوسروں کے آگے پیش کر دے ہماری آزادی پر جس طرح چاہے ڈاکہ زنی کرے ہم بہرحال اسی وطن کے ہی گن گائیں گے۔ دوسری طرف طرح طرح کی دھوکے بازی سے ہم کو آزادی کا جھانسہ دے کر چار پانچ سال بعد ایک ووٹ کی پرچی تھما دی جائے اور کہا جائے کہ عوام آزاد ہے۔ یہ آزادی نہیں ہے! جب انسان کا ضمیر ہی غلام ہو چکا ہو تو ووٹ کی پرچی ڈالنے سے انسان آزاد نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی طرح کہ جس طرح اگر ۶ فٹ کا آدمی ہو لیکن اگر اس کے اعصاب ہی جواب دے چکے ہوں تو پھر کوئی ننھا سا بچہ بھی اس کو شکست دے سکتا ہے۔ یہ آزادی نہیں۔

آزادی چیزے دیگر است؟

حقیقی آزادی تو یہ ہے کہ آپ ملکی سطح پر اپنے فیصلے خود کریں۔ آپ کی پالیسی خود اپنی ہی وضع کردہ ہو۔ آپ اپنے ملکی اور بیرونی معاملات خود طے کریں۔ کسی دوسرے ملک سے روابط رکھنا آپ کی اپنی آزاد مرضی پر منحصر ہو۔ کوئی دوسرا اگر آپ کے ملکی معاملات میں دخل اندازی کرنا چاہے تو آپ کی اپنی مرضی سے ہو آپ اپنے دفاعی معاملات کے ضمن میں اپنا بجٹ خود تجویز کریں۔ (آزادی اس کا نام ہے) آزادی کی ان شرائط میں سے کوئی شرط

بھی ہمیں حاصل ہے! اگر جواب نفی میں ہے تو ہم آزاد نہیں بلکہ غلام ہیں۔
کسی بھی ملک کا عدالتی نظام اسی لئے ہوتا ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کے معاملات اسی قانون کے تحت نبٹائے جائیں۔ لیکن اس وقت ان بچوں کی نفسیات پر کس طرح کی چھاپ پڑی ہو گی کہ جنھوں نے سنا ہو گا کہ ہمارے ملک کے باشندے کو دوسرا غیر ملک پکڑ کر لے گیا ہے اور ان کی قسمت کا فیصلہ دوسرے ملک کے قانون کے مطابق ہو گا۔ کیا ان بچوں کا دل خود بخود اس غلامی کی زنجیروں میں نہ جکڑا جائے گا جس غلامی میں آج ہمارا رواں رواں جکڑا جا چکا ہے۔ ذرا غور تو کیجئے دنیا اور ملکوں کی تاریخ سے ہٹ کر آپ نے کیسی ایٹمی صلاحیت حاصل کی ہے۔ ایسی ایٹمی صلاحیت کہ جس کو آپ اپنی مرضی سے اپنے دفاع کیلئے برقرار بھی نہ رکھ سکیں۔ بعض لوگوں نے اس کو اسلامی بم کا نام دیا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ اسلامی بم کے تقاضے پورے کرے۔

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری
بیابا من تو آموزم طریقے شاہ بازی را
(اقبالؒ)

"اگر کوئی چند ایک قطرہ خون کا ہے اور اگر مٹھی بھر پر اللہ نے دے رکھے ہیں یا ابھی باقی ہیں تو آؤ میں تم کو شاہ بازی کے طریقے سکھلاؤں۔"
اس کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کا وطن کی حدود سے آزاد ذہن ہونا چاہیئے۔ (ہم وطن غلامو) آپ اللہ کے دربار میں اس بات کے ذمہ دار نہیں ہوں گے کہ تم نے اپنی صلاحیتیں اپنے ہی ملک میں کیوں نہ صرف کیں بلکہ اس بات کے ذمہ دار ہوں گے اللہ ہم سے یہ پوچھے گا کہ

میری ہی بندگی کیوں نہ کی۔ میری بندگی کے راستے میں جو بھی رکاوٹیں آئیں ان کو دور کیوں نہ کیا۔ اس بندگی کے راستے میں انسان کا نفس' مال' اولاد' رشتہ دار' کاروبار اور وطن سب ہی رکاوٹ بن سکتے ہیں ان سب کو موقع اور وقت کے لحاظ سے دور کرنا پڑتا ہے! بقول شاعر

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گمان لا الہ الا اللہ
(اقبالؔ)

کسی شخص کا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جس ملک نے مجھ کو پالا پھر جوان کیا پھر باصلاحیت بنایا تو ان انعامات کے اعتبار سے اسی ملک کا حق بھی بنتا ہے کہ جب اس ملک پر کوئی برا وقت آن پہنچے تو اپنی صلاحیتیں اس کے لئے لگا دے۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ وقت اور موقع کے اعتبار سے ہر ایک چیز کے لئے ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کسی بھی آدمی کو ظاہر کے اعتبار سے باصلاحیت بنانے والوں میں سب سے زیادہ حصہ اس کے والدین کا ہوتا ہے۔ وطن والدین سے بڑھ کر اہمیت کا حامل نہیں ہوتا لیکن اولاد کے لئے ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ والدین کی اطاعت بھی ضروری نہیں رہ جاتی۔ وطن تو بڑی دور کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ مختلف مقامات اور مختلف اسالیب سے ایک بیٹے کو حکم دیتے ہیں کہ "اگر تمہارے والدین تم سے اس بات پر جھگڑیں کہ میرے ساتھ شرک کرو تو ان کی بات نہ مان۔" اصل میں یہ وقت کے بہتے دریا میں کسی نے وطنیت کی سیاہی گھول دی ہے۔ اس سیاہی کو کوئی مردِ قلندر ہی دیکھ سکتا تھا جس نے زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہا تھا کہ اے مسلمانو! اس وطن کے بُت کو توڑ ڈالو کہ یہ دورِ حاضر کے تراشیدہ بتوں میں سے ایک بُت ہے۔

اگر ہمیں صلاحیتیں لگانی ہیں تو کسی آزاد ملک میں لگائی جائیں جہاں ہم آزاد ہوں ورنہ ڈر ہے کہ ہو سکتا ہے کہ قبر بھی ہماری میت کو طمانچہ دے مارے۔ کسی ایسے ملک کا انتخاب کیا جانا چاہیئے جہاں ہم جرأت مندانہ اور آبرومندانہ زندگی بسر کر سکیں کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

یہ ملک تو گروی رکھ دیا گیا ہے کوئی ایسا ملک ہونا چاہیئے جہاں ہم اپنی دینی ذمہ داریاں بھی ادا کر سکیں اور دینوی اعتبار سے بھی ایک آزاد زندگی گزار سکیں۔ اس اعتبار سے میری یہی تجویز ہے کہ ہمیں اپنی نگاہیں اسلامی امارتِ افغانستان پر مرکوز کرنی چاہئیں اور اپنی صلاحیتیں وہاں لگانی چاہئیں اگر یہ سوال آپ کے دماغ میں آئے کہ کیا اس ملک میں اپنی صلاحیتیں لائیں جہاں کی ایک اینٹ سلامت نہیں رہ گئی جو پچھلے بیس سالوں سے تباہ حال ہے جو ترقی کے اعتبار سے نہایت پسماندہ ہے۔ یاد رکھئے! کسی بھی ملک کو بامِ عروج تک پہنچانے کے لئے وہاں کے باہمت لوگ اور وہاں کا باصلاحیت ذہن ہی ہوتا ہے نہ کہ وہاں کی فیکٹریاں اور بڑی بڑی عمارتیں' یورپ کو ستاروں کی گزرگاہوں کا مسافر بنانے والا یہی باصلاحیت ذہن تھا! غور فرمایئے جب یورپ میں احیاء العلوم کی تحریک چلی تو اس کے پیچھے بھی وہی ذہن تھا جو غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے علم سیکھ کر واپس اپنے گھروں میں آیا تھا۔ وہاں اطرح کا معاملہ تو نہیں ہوا تھا کہ غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں اور وہاں کے وسائل

کو اکٹھا کر کے یورپ لایا گیا بلکہ یہ باصلاحیت ذہن اور باہمت لوگ تھے جنہوں نے پوری دنیا کو فتح کر لیا۔

اب اگر مرض کی تشخیص ہو چکی ہے کہ اصل مرض کیا ہے تو پھر جرأت اور ہمت کی ضرورت ہے اس کے لئے میرے نزدیک اس عمل کے مختلف اور ممکنہ مراحل یہ ہو سکتے ہیں کہ

۱) سب سے پہلی سطح یہ کہ ہمارے حکمران اور عوام اجتماعی طور پر اس مسئلہ کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اصولی طور پر افغانستان کے امیر کی اطاعت قبول کر لیں۔ ان دونوں ممالک کا معاملہ کس طرح چلے گا یہ بحث کتاب کے آخری صفحات میں درج ہے۔

۲) دوسری سطح یہ ہے کہ اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا کر اس بات کو لوگوں تک پہنچایا جائے اور اسی کام کے لئے مقتدر طبقے اور عوام کے اذہان ہموار کئے جائیں۔

۳) تیسری سطح یہ ہے کہ ایک خاص مدت تک یہ سارے کام لوگوں کی ذہن سازی کے لئے ہوتے رہیں اس کے باوجود اگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلے تو انفرادی طور پر افغانستان کی سرزمین کو ہجرت کے لئے چن لیا جائے۔ یہ ممکنہ صورتیں ہیں جو ہمیں پیش آ سکتی ہیں۔

آخر میں میں پھر اپنی قارئین اور مخاطبین سے گزارش کرتا ہوں کہ کوئی شخص اپنا پورا ذہن اپنی تحریر میں پیش نہیں کر سکتا' بہت سی باتیں ذہن میں ہی رہ جاتی ہیں اور کئی باتوں کی وضاحت بھی اجمالاً ہوتی ہے لیکن اگر اس بات کو پڑھنے والا اپنے بھی ذہن کو وسیع کر کے مطالعہ کرے اور بات لکھنے والے کو

اپنی بات کی وضاحت کا موقع دے تو پھر بات الجھنے کی بجائے سلجھ جاتی ہے اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی باہم مذاکرہ بھی ہو سکتا ہے یا یہ مذاکرہ کسی مقامی اخبار کے فورم پر بھی ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی اس طرح کا کام کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہو گا۔

افغان خودی

انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات و واقعات پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان کی قومیں اتنی واضح نشانیاں دیکھ کر بھی ان پر ایمان کیوں نہ لائیں۔ بعض انبیاء و رسل علیہ السلام کے متعلق یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس قوم کی طرف وہ بھیجے جاتے تھے۔ اس زمانے کی اقدار کے مطابق اس قوم پر حجت تمام کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادوگری کا فن عام تھا۔ اس قوم پر حجت تمام کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی قسم کے معجزات سے نوازا۔ عصاء کا اژدھا بن جانا اور ید بیضا وغیرہ اس زمانے کے مطابق ہی تھے۔ جب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا وقت آیا تو عربوں میں ادبی ذوق اس انتہا پر تھا کہ عرب اپنے سوا پوری دنیا کو گونگا سمجھتے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسی فصاحت و بلاغت سے بھرپور اور ادبی شہہ پارہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ اس آسمانی کلام کے سامنے وقت کے بڑے بڑے شعراء ہیچ تھے۔ اگرچہ قرآن کوئی شعری کلام نہ تھا۔ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ انبیاء و رسل کو نہ ماننے کی وجہ کیا تھی؟ زمانے کی روایات کے مطابق حجت تمام کرنے کی وجہ سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ تو ہمیں جیسا ایک شخص ہے صرف اس میں کچھ صلاحیتیں ہماری نسبت زیادہ ہیں تو کیوں ہم اپنے ہی جیسے ایک انسان کو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم مان لیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

متعلق بھی یہی سمجھا گیا کہ یہ نسبتاً بڑا جادوگر ہے۔ (معاذ اللہ) حضرت محمد ﷺ کے وقت بھی عرب قوم اسی بیماری کا شکار رہی کہ یہ جو کلام پیش کر رہے ہیں۔ بڑا اچھا ادبی کلام ہے۔ یہی نفسیات تھی جو انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت کو ماننے میں رکاوٹ بنتی رہی۔

نبی اکرم ﷺ نے جو بعض پیشن گوئیاں فرمائیں ان کو سمجھنے کے لئے اسی اصول کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ ذرا دقت نظر سے دیکھیں تو آپؐ نے قیامت کے نزدیک کی جو خبریں دیں ان میں ایک یہ ہے کہ لوگ سرعام اپنی محفلوں میں زنا کریں گے۔ اس وقت آپؐ کے اصحابؓ حیران ہوئے ہوں گے لیکن آج اگر ہم غور کریں تو یہ حیران ہونے والی بات نہیں صرف آج اگر ہم اس دور کی نفسیات کو سمجھ لیں تو حضور ﷺ کی اس خبر کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہو گی۔ کیا یہ بات سرعام زنا کرنے سے کسی قدر کم ہے کہ جس قدر آج جنسی سکینڈل کا چرچہ عام ہوتا ہے اور جس طرح لوگ اپنی نجی اور اجتماعی محفلوں میں ان سکینڈلز کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جس طرح شادی شدہ اور غیر شادی شدہ افراد کو یہ باتیں سننی پڑتی ہیں اور جس طرح جذبات کا طوفان لوگوں کے اندر موجیں مارتا ہے۔ کیا وہ زنا سے کم ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کے افعال اور حرکات کا تذکرہ زانی اور زانیہ کی طرف سے اخبارات میں ہوتا ہے۔ زبان سے یہی الفاظ نکلتے ہیں کہ کہنے والے نے سچ ہی کہا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ زنا عام ہو جائے گا۔ آج زمانہ ترقی اور تہذیب کی جن حدوں کو چھو رہا ہے اس میں یہ بات ایک کلچر سے زیادہ آگے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ہمارے لئے ان حالات و واقعات سے عبرت کا ایک ذرہ سبق بھی حاصل کرنا ویسا ہی مشکل ہو

گیا ہے جیسا کہ پچھلی قوموں کے لئے انبیاء کے وقت ان کو ماننا مشکل تھا۔ اِلا ما شاء اللہ

قرآن میں (دابۃ الارض) کا ذکر بھی ملتا ہے کہ قیامت کے نزدیک زمین سے ایک ایسا جانور نکلے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا۔ شاید اس دور کا انسان اس واقعہ کو بھی سائنس کی اس ترقی کی وجہ سے عبرت کی بجائے سائنس کا ایک عجوبہ ہی سمجھ لے (واللہ واعلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک وقت آئے گا کہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر یا کمبلوں سے بنا ہوا کوئی خیمہ نہ رہے گا۔ مگر اس میں اللہ کا دین داخل ہو کر رہے گا۔ اس حدیث میں بنیادی بات سمجھ لینی چاہئے کہ کمبلوں سے بنے ہوئے خیموں کا علاقہ عرب کی سرزمین تھی اور اینٹ گارے سے بنے ہوئے گھر اس وقت کی اور آنے والی متمدن دنیا کی سرزمین مراد ہے یعنی ایک وقت آئے گا کہ ساری دنیا پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ اب ذرا دیکھئے کہ اس غلبے کی ترتیب جو بنے گی وہ تو یہی ہے کہ کسی ایک ملک میں پہلے اسلام کا غلبہ ہو گا پھر دوسرے مرحلے میں اسی ملک سے ان مجاہدوں کی سرفروشیوں کی وجہ سے دوسرے ممالک میں بھی اسلام کا غلبہ ہو جائے گا یہ تو ممکن نہیں کہ ایک ہی مرحلے میں پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں وطنیت کے نظریئے نے مذکورہ بالا ترتیب کو دھندلا دیا ہے اور انسان قاصر ہے یہ سوچنے سے کہ اگر ایک ملک میں غلبۂ دین ہو جائے تو دوسرے ممالک اس ملک کو اپنا ہی ملک سمجھیں اور وہاں کے مسلمان بھائیوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہوئے اپنے درمیان ملکی حدود کی

اہمیت کو ختم کر دیں۔

بلکہ معاملہ اس کے برعکس یہ ہے۔ آج انسانوں کے دلوں میں صرف اپنے ہم وطنوں کی محبت پلا دی گئی ہے۔ آج کے دور کی اسی نفسیات نے اس بات کے امکانات کم کر دیئے ہیں کہ ہم حضور اکرم ﷺ کی پیشن گوئی کی ترتیب کو سمجھیں۔

بہر حال بحالت موجودہ ہم اپنے اپنے ممالک کی حدود میں کام کرنے کے تصور کے تحت یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ عالمی غلبہ کس طرح ہو جائے گا؟ اور اس عالمی غلبے کی بنیاد اور اس کے لئے معیار کیا ہو گا۔

اس ساری بحث کو سامنے رکھتے ہوئے اگر آج افغان قوم بھی اپنی خودی پہچان لے تو اس عالمی غلبے کے لئے راستہ ہموار ہے۔ طالبان کو آج کی دنیا کے ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے سوچنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کس درجہ اہم ذمہ داری سونپی ہے۔ آج اگر طالبان اپنی موجودہ صورت حال کو اپنے لئے اللہ کا بڑا انعام سمجھتے ہیں تو اس بات کو بھی مستحضر رکھنا چاہیئے کہ جس پر جتنا بڑا اللہ کا انعام ہوتا ہے۔ اتنی ہی کٹھن ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ مثلاً اگر یہود کو اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا پر فضیلت عطا کی تھی تو ان کی ذمہ داری اسی تناسب سے بڑی تھی کہ وہ دین کو قائم رکھتے اور نوع انسانی کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب انہوں نے اس ذمہ داری کو پورا نہ کیا تو وہی قوم جس کو اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی فضیلت سے نوازا تھا اسی قوم پر پھٹکار پڑی اور ان پر ذلت و مسکنت مسلط کر دی گئی۔ اسی طرح اگر اُمت محمدیؐ کو اُمت وسط اور خیر اُمت کا اعزاز بخشا گیا ہے تو اس پر پوری نوع

انسانی کی ہدایت کی ذمہ داری بھی لگا دی ہے۔ آج اگر اللہ نے پوری اُمت محمدیؐ میں سے سرزمین افغانستان کو اپنے دین کے لئے چن لیا ہے تو اس کے پیچھے بھی اللہ کی یہی سُنّت دکھائی دیتی ہے کہ "ہم دیکھیں گے کہ تم کیا کرتے ہو۔"

جس طرح اللہ پوری کائنات کا خالق و مالک اور حاکم ہے۔ اسی طرح اللہ کا دین بھی پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ جس طرح اللہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا حاکم ہو اسی طرح وہ یہ بھی پسند نہیں فرماتا کہ اس کے بندوں پر کوئی دوسرا حاکم بن بیٹھے۔ اسی لئے اللہ کا دین آفاقی ہے۔ آج اگر افغانستان میں اللہ کا دین قائم ہے تو اسے پوری دنیا میں پھیلنا چاہئے کیونکہ یہ پوری نوع انسانی کی گمشدہ متاع ہے۔ چنانچہ طالبان کو چاہئے اور ان پر فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ پوری دنیا سے ظلم کا خاتمہ کرنے کا عزم رکھیں۔ اس کے لئے پوری اُمت مسلمہ بھی ان کی مدد و معاون بن کر ان کی "امارت" میں شہادت علیٰ الناس کا فریضہ انجام دے اگر کسی حکمت عملی کی وجہ سے اب تک طالبان کی طرف سے یہ ہدف سامنے نہیں آیا تو دوسری بات ہے ورنہ انہیں اس بات کو ذہن میں مستحضر رکھنا چاہئے کہ جہاں بھی نوع انسانی ظالمانہ نظام کے تحت پس رہی ہے وہاں سے ظالمانہ نظام ختم کر کے نوع انسانی کو ظلم کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لانا ان کا فرض ہے۔ چاہے وہ ظالم ملک کوئی مسلم ملک ہو چاہئے غیر مسلم ملک ہو۔

اگرچہ طالبان حکومت کے عہدے داروں کی طرف سے ذو معنی باتیں پڑھنے میں آتی ہیں مثلاً :

① پوری اُمت کو یکجا ہونا چاہئے۔
② جب تک اُمت جہاد کا راستہ اختیار نہیں کرتی اس ذلت و رسوائی سے نجات نہیں پا سکتی۔
③ اُمت کو چاہئے کہ کسی ایک امیر کی قیادت میں جمع ہو جائے۔

اس طرح کی ڈھکی چھپی باتوں کی بجائے انہیں چاہئے کہ اُمت کو واضح پروگرام دیں کہ ہمارا ہدف پوری دنیا سے ظلم کا خاتمہ کرنا ہے۔ اگر تو کسی حکمت کے تحت ابھی اس کا اعلان عام نہیں کر رہے تو یہ الگ بات ہے۔ وگرنہ اگر مستقل یہی روش ہوئی کہ انہیں اپنے ہی ملک میں دین کی ساری محنت کرنی ہے تو طالبان کو یہ بھی ذہن میں رکھنا ہو گا کہ پھر اللہ تعالیٰ کی بھی مستقل سُنّت یہ ہے کہ جو قوم اللہ کے دین کی گواہی دینے کی بجائے کتمان حق کرتی ہے تو اللہ اس کو مردود قوم قرار دے کر کسی دوسری قوم کے ہاتھ میں دین کا جھنڈا پکڑا دیتا ہے۔ اللہ کے دین کے ہم محتاج ہیں نہ کہ اللہ۔ اگر ایک قوم اللہ کے دین کی نمائندگی صحیح طور پر نہیں کرتی تو اللہ اس قوم کا اس معنی میں محتاج نہیں کہ اُسی قوم کے ہاتھ سے لازمی اپنے دین کی ضرورت پوری کروائے بلکہ وہ کسی ایسی قوم کو چن لیتا ہے جو کہ حقیقتاً اس کے دین کی محتاج بن کر اس کے دین کو پھیلائے۔

تاریخ ہمیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگر ایک وقت میں یہود اللہ کے دین کے علمبردار تھے تو ان کی دین کے ساتھ بے وفائی برتنے کی صورت میں اللہ نے اس قوم کو رد کیا اور اُمت محمدی ﷺ کو اپنے دین کے لئے مختص فرما دیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اہل عرب کو دین کی علمبرداری سے دست بردار کر کے اپنے دین کا جھنڈا ماضی کی کافر قوم کے ہاتھوں پکڑا دیا۔ اسی طرح آج پوری اُمت مسلمہ بلکہ متمدن دنیا کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے نسبتاً کم ترقی یافتہ افغانستان کو اس کام کے لئے چن لیا ہے۔ اور اس بات کا اعزاز بخشا ہے کہ اپنے دین کا جھنڈا طالبان کو پکڑایا ہے۔ ایک طرف یہ ان کے لئے اعزاز ہے تو دوسری جانب ان کی ذمہ داری بھی اتنی ہی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اگر طالبان نے اللہ کے دین کو پھیلانے اور اس کی گواہی کا حق ادا نہ کیا اور دوسری طرف پوری اُمت مسلمہ نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے افغانستان کے امیرالمومنین کو اپنا امیر تسلیم کر کے اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی نہ کی تو اُمت کیلئے ذلت و رسوائی ہی مقدر رہے گی۔

اپنی خودی پہچان اے اُمت مسلمہ

بابِ مباحثہ

(اعتراضات اور ان کے جوابات)

یہ باب کچھ ممکنہ سوالات اور ان کے جوابات پر مبنی ہے بلکہ صحیح تر الفاظ میں یہ باب ان مباحثوں پر مشتمل ہے کہ جب میں نے مختلف اوقات میں اپنے بعض کرم فرماؤں کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس وقت ان کے جوابات کی شکل میں سامنے آئے اور ان کی اجازت سے پھر یہ سوال و جواب ایک مباحثہ حسنہ کی صورت اختیار کر گئے۔ ان سوالات کو اعتراضات بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ

اعتراض شہادت علی الناس کو اُمت مسلمہ کا فرض منصبی قرار دینا ہی غلط ہے۔ یہ اُس وقت کی اُمت مسلمہ پر فرض نہیں بلکہ اس وقت کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر فرض تھا جیسا کہ آیت میں فرمایا گیا۔ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہو جائے اور تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور یہ شہادت علی الناس حضور اکرمؐ کے زمانے ہی میں ہو گئی تھی یعنی جب عرب میں انقلاب مکمل ہو گیا تو شہادت خود بخود قائم ہو گئی تھی۔

جواب یہ بات کچھ جزوی اعتبار سے ٹھیک معلوم ہوتی ہے اور وقتی طور پر عقل کو اپیل بھی کرتی ہے کہ واقعتاً جن لوگوں پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت قائم کی ہو انہی کا ہی حق بنتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں پر شہادتِ حق قائم کریں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ براہ راست باقی اُمت

پر شہادت حق قائم نہیں کی اس لئے پوری اُمت بھی اس بات کی مسئول نہیں ٹھہر سکتی۔

اب سب زاویوں پر غور کیا جائے تو کچھ حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں کہ اگر یہ سمجھا جائے کہ شہادت علی الناس حضور اکرمؐ کے زمانے میں ہی دنیا پر قائم ہو گئی تھی تو پھر صحابہ کرامؓ بعض ممالک اور اقوام کے خلاف کیوں چڑھ دوڑے اور پھر یہ تین شرائط اقوام کے سامنے کس لئے پیش کرتے تھے کہ (۱) ایمان لے آؤ ہمارے برابر کے ہو جاؤ گے۔ (۲) ورنہ جزیہ دو اور چھوٹے ہو کر رہو (۳) اگر یہ دونوں باتیں قبول نہیں تو تیسری کے لئے تیار ہو جاؤ یعنی تلوار ہمارے اور تمہارے مابین فیصلہ کرے گی۔ یعنی صحابہ کرامؓ اس درجے کی شہادت قائم کر رہے تھے کہ ہر انسان کے لئے وہ ماحول پیدا کر دیا جائے کہ اسے حق کے قبول کرنے میں کسی قسم کا دباؤ پیش نہ آئے یعنی ایسا عادلانہ نظام بالفعل قائم کرنا چاہتے تھے جس سے اللہ کی مخلوق بندوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آجائے۔ حق اور باطل اس طرح واضح ہو جانے کے باوجود اگر پھر بھی کوئی شخص حق کو نہیں مانتا تو ایک طرف وہ دنیا میں چھوٹا ہو کر رہے گا اور دوسری طرف آخرت میں عنداللہ مجرم قرار پائے گا۔ معلوم ہوا کہ شہادت خود بخود قائم نہیں ہو گئی تھی بلکہ صحابہ کرامؓ شہادت قائم کرنے میدان جہاد میں نکلے تھے پھر اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ صحابہ کرامؓ جن لوگوں تک پہنچ گئے۔ صرف ان تک ہی شہادت قائم

کرنے کے ذمہ دار تھے اس بات کا جواب اپنے کرم فرماؤں کی خدمت میں ایک سوال کی شکل میں رکھنا چاہتا ہوں کہ ان کی یہ بات عربی گرائمر کی رو سے کس طرح درست ہو گی حالانکہ زیر بحث آیت ﴿شهدا علی الناس﴾ علی الناس کا "الف" اور "لام" کا اشارہ صرف دو ہی حالتوں کے لئے ہو سکتا ہے ایک خاص دائرہ کے لوگوں کے لئے اور دوسرا پوری نوع انسانی کے لئے اس میں یہ مفہوم نکالنا کہ وہ لوگ کہ جن تک صحابہؓ پہنچ گئے وہی لوگ مراد ہیں تو یہ عربی گرائمر کی رو سے ہی غلط ہو گا۔ ان دو مفاہیم کو سامنے رکھیں تو سیرتِ صحابہؓ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کسی خاص دائرہ کے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کے لئے نکلے تھے حضور ﷺ پوری نوع انسانی کے لئے ہدایت کا چراغ بن کر تشریف لائے لیکن اپنے عہد مبارک میں ہی ایک اُمت وسط اور خیر اُمت کو بھی پوری نوع انسانی کے لئے تربیت دے گئے اور نوع انسانی تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے اس کی ذمہ داری لگادی۔ اب ہر مسلمان جو کہ اُمت مسلمہ کا مخاطب بننا چاہتا ہے اور خیر اُمت میں شامل ہو کر اپنے لئے اللہ کی طرف سے اسی طرح کے القابات کا فیض لینا چاہتا ہے تو پھر اس اُمت کی ذمہ داری اور جو بوجھ اس اُمت پر ڈالا گیا تھا اس میں حصہ دار ہو گا بالکل اسی طرح جس طرح کسی ملک میں پیدا ہونے والا بچہ جب جوان ہوتا ہے تو بغیر کسی حلفیہ بیان کے وہ اپنے ملک کے دستور اور قانون کا پابند ہوتا ہے۔ کتنی خود غرضی ہو گی کہ

وہ شخص ملک کی ہر سہولت کا فائدہ تو اٹھا رہا ہو لیکن کسی جرم کی دفعہ کی زد میں آ جانے کے بعد وہ مطالبہ کرے کہ (یہ قانون میں نے تو نہیں بنایا لہٰذا سزا کس بات کی بلکہ یہ قانون تو کسی پہلی اُمت یعنی ہمارے آباؤ اجداد نے بنایا تھا) ظاہر ہے کہ ہر شخص اسے وہی کہے گا جو آپ اس وقت سوچ رہے ہیں۔ ہاں اس کے بچنے کی ایک صورت تھی کہ وہ ہوش سنبھالتے ہی اس ملک سے لاتعلقی کا اعلان کر کے کسی دوسرے ملک میں زندگی بسر کرنا شروع کر دیتا۔

اگر ہم بھی آج اس اُمت محمدی ﷺ اور اُمت وسط اور خیر اُمت کے القابات کا تو اپنے لئے خیر مقدم کریں اور اس حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو قبول نہ کریں تو اللہ کے ہاں جواب دیہی ہو گی اِلاّ یہ کہ ہم میں سے اگر کوئی اس جواب دہی سے بچنا چاہتا ہے تو پھر اسے اُمت سے لاتعلقی کا اظہار کرنا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت گھاٹے کا سودا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

اعتراض افغانستان کے امیر کو اُمت اپنا امیر کیوں مان لے حالانکہ وہ ایک غریب سا ملک ہے۔ وسائل کی شدید قلت ہے۔

جواب ان سوالات پر یا اعتراضات پر غور کیا جائے تو آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ وسائل کو معیار بنانا ہی نہیں چاہئے۔ وہ تو ہر مسلم ملک اور غیر مسلم ملک چاہے گا کہ اس کے پاس وسائل زیادہ سے زیادہ ہوں اور اس اعتبار سے وسائل تو سب ممالک کے پاس کم اور زیادہ ہی ہوں گے۔ مثلاً پاکستان کے پاس افغانستان کی نسبت زیادہ وسائل

ہوں تو کوئی دوسرا ملک بھی تو ہو گا کہ جس کے پاس پاکستان کی نسبت زیادہ وسائل ہوں گے اگر پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو جاتا ہے تو نسبتاً زیادہ وسائل والے ممالک اگر کہہ دیتے کہ اسلامی نظام کے قیام کی کوشش تو ہمارے ممالک میں ہونی چاہئے پاکستان تو غریب سا ملک ہے اس طرح وحدت اُمت کا مسئلہ تو حل نہیں ہو سکتا۔

اس مسئلے کے حل کے لئے وسائل کو نہیں بلکہ اسلام کو بطور معیار اپنانا چاہئے اور شرط یہ ہونی چاہئے کہ وسائل چاہے کتنے ہی کم ہوں انہی وسائل کو بروئے کار لاکر کوئی ملک اسلام کی بنیادی سطح پر آگیا یا نہیں۔ اگر بیں لائن مکمل ہو گئی ہے تو وسائل تو ہر ملک اپنے دفاع کے لئے تلاش کر ہی لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ بھی اپنے بندوں کے لئے انفاق کے ضمن میں خلوص اور تقویٰ دیکھتا ہے نہ کہ مقدار اور تعداد مثلاً اگر ایک آدمی کے پاس ۱۰۰ روپیہ ہے اس نے وقت پڑنے پر اللہ کی راہ میں ۵۰ روپے خرچ کر دیئے دوسرے شخص کے پاس ۱۰۰۰ روپے ہیں اور اس نے ۱۰۰ روپے اللہ کی راہ میں خرچ کئے۔ ہمارے دیکھنے میں دوسرے شخص نے اللہ کی راہ میں زیادہ خرچ کئے ہیں لیکن اللہ کی نگاہ میں تو حساب اسی طرح لگایا جائے گا کہ پہلے شخص نے اللہ کی راہ میں اپنے مال کا نصف حصہ یعنی آدھا دے دیا اور دوسرے شخص نے اللہ کی راہ میں اپنے مال کا صرف دسواں حصہ دیا۔ غور کیجئے کہ اگر پہلے شخص کے پاس وسائل اور مال آجائے تو کیا وہ معاشرے میں

ظلم اور غربت رہنے دے گا۔ یقیناً دوسرے شخص کی نسبت وہ جلدی اپنے مقصود تک پہنچے گا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ کسی بھی ملک میں اسلام کو معیار بنا کر اس کی مدد کرنی چاہئے اور مدد بھی ایسی کہ جیسی اسلام میں مطلوب ہے۔

اعتراض پھر میرے کسی کرم فرما کی طرف سے یہ بھی اعتراض ہوا کہ (ہم اپنے اپنے ہی ممالک میں غلبہ اسلام کی محنت کیوں نہ کریں۔ جب چند ممالک میں اسلام کا غلبہ ہو جائے گا تو پھر وہ مخلص اسلامی ممالک کے حکمران اپنے میں سے کسی نیک آدمی کو امیر بنالیں گے۔

جواب اس مسئلے پر ذرا غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہو گا کہ یہ ایک خوش گمانی تو ہو سکتی ہے حقیقت نہیں۔ وہ اس لئے کہ جن شخصیات پر آپ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ممالک میں اسلامی حکومت بنانے کے بعد کسی نیک اور اہل آدمی کو اپنا امیر بھی مان لیں گے کس دلیل کی بنیاد پر آپ ان سے یہ خوش گمانی رکھتے ہیں۔ اگر ،صرف ہم اتنا ہی کہہ دیں کہ اللہ ان کو جمع کردے گا تو پھر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت بھی ذہن میں رکھنی چاہئے جس میں فرمایا گیا اپنے موقف کی بنیاد کسی ایسی بات پر نہ رکھو جس کا تم کو علم ہی نہ ہو بلکہ سماعت' بصارت اور عقل پر ہونی چاہئے۔ بلکہ اس خوش گمانی کے غبارے سے ایک ہی بات سے ہوا نکل جاتی ہے کہ یہ سب اسلامی تحریکیں اور جماعتیں اگر کسی ایک شخص کو امیر تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتیں تو اب اِسی وقت ان کو ایک امیر کے تحت جمع ہو جانا چاہئے تھا

جبکہ سب ہی مان رہے ہیں کہ بلاشبہ افغانستان میں بنیادی اسلامی حکومت موجود ہے۔ جب ان جماعتوں کی امارت میں اپنے اپنے ممالک میں اسلامی حکومتیں قائم ہو جائیں گی تو اس وقت تو ان کے بہت سے مفادات بھی اس وحدت ملت کے راستے میں حائل ہو جائیں گے کیونکہ اس وقت یہ لوگ خود اپنے اپنے ممالک کے سربراہ ہوں گے جبکہ اب یہ کیفیت نہیں تو اس وقت اسلامی جماعتوں کے سربراہوں کا مان لینا ممکن اور آسان نظر آتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ جب ان کی اپنی اپنی اسلامی حکومتیں ہوں گی۔

اعتراض اِس دور میں کیا ضروری ہے کہ ایک ہی شخص پوری اُمت کا امیر ہو۔ جبکہ یورپین ٹائپ ممالک کا سا اتحاد بھی وجود میں آسکتا ہے۔

جواب ہمیں اصولی اعتبار سے جان لینا چاہیئے کہ کسی بھی اتحاد کا نظم سخت یا نرم اس کے مقاصد کے پیش نظر ہوتا ہے اگر مقصد کوئی ہنگامی قسم کا ہے تو اتحاد کا نظم بھی سخت اور کسا ہوا ہو گا۔ اگر کسی گروہ کا مقصد صرف خدمت خلق ہی ہے تو اس کا ڈسپلن سخت رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں فوج کا ڈسپلن اس کی نسبت اس لئے سخت ہوتا ہے کہ اس نے دشمن سے ٹکر لینے کے لئے ہر تدبیر اختیار کرنی ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام کے پیش نظر نوع انسانی کو ظلم کی چکی سے اور بندوں کو غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لاتا ہے۔ اس کام کے لئے جہاد اور قتال جیسے ہنگامی مراحل سے گزرنا ناگزیر ہے۔ اس لئے اسلام میں اتحاد کا ایک الگ نظام ہے اور وہ ہے ایک امیر اور باقی

سب مامور۔

نہ کہ یورپین ممالک ٹائپ کا سا اتحاد جن کے پیش نظر آپس میں چند کاروباری مفادات کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جہاں بانی اور دوکانداری میں بہت واضح فرق ہے۔ اپنے اپنے ممالک میں اسلام کو قائم کرنے کی جدوجہد اس وقت تو کوئی وزن رکھتی تھی کہ جب کسی بھی ملک میں اسلام کا نظام قائم نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ کسی کو یہ معلوم اور یقین نہیں تھا کہ اللہ کس کے ہاتھ میں اسلام کا جھنڈا پکڑائے گا لیکن اب جبکہ اللہ نے اس کام کے لئے افغانستان کی سرزمین کو چن لیا ہے تو باقی پوری اُمت مسلمہ کو سابقون الاولن من المھاجرین والانصار کا سا رویہ اختیار کرتے ہوئے اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہونا چاہئے۔ ان بلند مراتب کے خواہاں حضرات خوشیاں منائیں کہ اللہ نے ان کی زندگی میں ہی یہ موقع عطا فرما دیا کہ انہیں کے ہاتھوں اسلام کا عالمی غلبہ ان کی راہ دیکھ رہا ہے۔

﴿ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴾

اعتراض طالبان کا یہ اسلام کیسا اسلام ہے جس سے داڑھی کا سائز ہی پورا نہیں ہو رہا۔ گویا یہ فقہی اسلام فرقہ وارانہ اور دیوبندی اسلام ہے۔ اصل اسلام کا نقشہ نہیں، عورتوں کو گھروں میں بند کر دیا گیا ہے۔

جواب غور کریں تو سارے الزامات ہمارے ہی خلاف جاتے ہیں نہ کہ طالبان کے۔ اس لئے کہ ہم ہی ہیں جو کہ پاکستان کی گلیوں میں اس

بات کو باآواز بلند پیش کر رہے ہیں کہ کسی بڑے مقصد کے حصول کے لئے یہ چھوٹے چھوٹے فقہی اختلافات کو دور رکھنا چاہئے ایک مثال کو سامنے رکھ کر ہم بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ فرقہ واریت کا آغاز کیسے ہوتا ہے؟ کسی وقت آپ اور آپ کا دوست اپنے خلافِ مسلک مسجد میں نماز پڑھتے ہیں تو نماز سے فارغ ہو کر آپ کا دوست اس امام مسجد پر طرح طرح کے اعتراضات کرنے کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اس نے تو میری نماز خراب کروادی لیکن آپ نماز جیسے بڑے مقصد کے حصول کے لئے اس امام مسجد کے متعلق مثبت رائے رکھتے ہیں تو یہاں غور کیجئے کہ فرقہ واریت وہ امام مسجد نہیں بلکہ آپ کا دوست پھیلا رہا ہے۔ جو کہ کسی دوسرے مسلک کے امام کے پیچھے نماز ادا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ یہاں یہ اصولی بات سامنے رکھتے ہوئے افغانستان کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی بھی ملک میں جب انقلاب آتا ہے تو کئی ایسی اصلاحات کرنی پڑتی ہیں جو وقتی طور پر واقعی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ پہلی کئی چیزوں کو ختم کرکے از سرنو تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے لئے غور طلب بات یہ ہونی چاہئے کہ کسی ملک یا ریاست کی سطح پر اس نے حرام کو حلال تو نہیں ٹھہرا لیا اور حدود و تعزیرات کے معاملے میں کسی ملک کی کیا پیش رفت ہے۔ ہمیں دراصل ان بڑے مقاصد کو سامنے رکھنا چاہئے جو ہم سب میں یکساں پائے جاتے ہیں۔

سود کا حرام ہونا' جوا' نشہ کا حرام ہونا' چوری کی سزا' ڈاکہ زنی

کا سدباب' بے پردگی سے بڑھ کر زنا کے لئے سخت قوانین کا نفاذ اور معاشرے میں طبقاتی نظام ختم کرنا' فوری انصاف کا مہیا کرنا یہ ساری باتیں ہیں جو سب کے نزدیک یکساں حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کو چھوڑ کر میں داڑھی کا الزام طالبان پر لگا کر ان کے خلاف فرقہ واریت کا اشتہار لگاتا پھروں تو دراصل فرقہ واریت میں پھیلا رہا ہوں نہ کہ طالبان۔ کیونکہ میں بڑے مقصد کو بھول کر چھوٹے اختلافی مسائل کو سامنے رکھ کر بیٹھ گیا ہوں جو کہ مسئلہ کا حل نہیں۔ ان سب اصلاحات (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) کے مقابلے میں ہم ترقی یافتہ ممالک میں چوربازاری' اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ' نسلی اور لسانی بنیادوں پر طبقاتی معاشرہ' اقربا پروری اور رشوت خوری جیسے معاشرہ کو تباہ و برباد کرنے کے والے عناصر کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔

اور پھر دوسری بات یہ کہ میرے گھر بیٹھے بٹھائے تجویز کے لئے وہ میری بات کیسے مان لیں کہ داڑھی کو ایسا ہونا چاہئے ویسا نہیں ہونا چاہئے۔ جبکہ جہاد و قتال کے مراحل سے وہ گزر رہے ہوں' بھوک اور خوف کی کیفیت سے ان کا پالا پڑ رہا ہو۔ مشکلات کا سامنا وہ کر رہے ہوں' اسلام کے لئے جان ہتھیلی پر وہ رکھے ہوئے ہوں۔ راتیں ان بیچاروں کی جاگ کر گزریں۔ محاذوں پر ہڈیوں میں گودا جما دینے والی سردی وہ برداشت کر رہے ہوں میں یہاں مزے سے اپنے سٹڈی روم میں بیٹھا مطالعہ کرتے ہوئے داڑھی کے متعلق اپنا

نکتہ نظر پیش کر کے سمجھوں کہ بڑا دین کا ستون کھڑا کر دیا ہے اور اس کے بدلے امید کروں کہ مجاہدین افغانستان مجھے امیرالمومنین مان کر کہیں کہ آیئے امیرالمومنین اپنی جگہ سنبھالئے تو ایسا ممکن نہیں۔ پہلے مجھے اسلام جیسے بڑے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اختلافی اور مسلکی مسائل کو ذہن سے دور کرنا ہو گا اور اپنی انا کی قربانی دینی ہو گی اور اسلام کے ساتھ اپنے خلوص کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے ساتھ ملنا ہو گا اور پھر پر امید رہنا چاہیئے کہ جب بین الاقوامی سطح پر اتحاد کی کوئی شکل بنتی نظر آئی تو طالبان یقیناً اس مسئلے پر سوچیں اور نظرثانی کریں گے کیونکہ یہ حرام اور حلال کا مسئلہ نہیں بلکہ فقہی مسئلہ ہے۔

اور پھر مجھے بھی وسعت قلبی کا ثبوت دیتے ہوئے سوچنا چاہیے کہ اگر طالبان کسی فقہی مسئلہ کا نفاذ کسی حکمت کے تحت کر رہے ہیں تو باقی جو ہم سب میں یکساں ہیں اور بڑے مقصد کے حصول کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے اتفاق کرنا چاہیئے۔

اعتراض طالبان تو ابھی حالت جنگ میں ہیں انہیں اپنے ہی ملک سے فرصت نہیں مل رہی وہ اپنے ہی اندرونی حالات میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ خوف و ہراس کی کیفیت ہے۔

جواب ان مسائل کے حل کے لئے میں پھر ایک بار یہی تجویز دوں گا کہ ہم مسلمانوں کو اسلام کے علاوہ کسی دوسری بات کو معیار نہیں بنانا چاہیۓ ہمارے دیکھنے کی چیز صرف یہ ہونی چاہیۓ کہ طالبان جہاں بھی

پہنچے یا پہنچ رہے ہیں وہاں وہ اسلام کا نفاذ کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہم یہاں بیٹھے بیٹھے طالبان کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ یہ مشکلات کیا طالبان کے لئے اسلام کے نفاذ میں رکاوٹ بنی ہیں۔ جنگ ان کے لئے نفاذ اسلام کے راستے میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوئی۔ پھر ہم کو بھی یہ اعتراض اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے اور پھر یہ فطری بات کہ کیا ملک کے محاذ سے جنگ ختم ہونے کے بعد شیطانی قوتیں طالبان کو سکون سے بیٹھنے دیں گی؟ اس طرح کا امن و امان تو اس وقت بھی نہیں ہو گا اس وقت بھی یہی فکر دامن گیر ہو گی کہ کبھی کسی محاذ سے خطرہ ہے کبھی ایران کے محاذ سے خطرے کی گھنٹی بجنی شروع ہو جائی گی۔ کیسا عجیب معیار ہے ہمارا امن و امان ناپنے اور تولنے کا۔

جس طرح جان و مال عزت و آبرو حقوق انسانی' احترام جان اور دیگر خباثتوں سے پاک انسانی ماحول افغانستان میں آپ کو دکھائی دیتا ہے۔ کسی دوسرے مسلمان ملک میں آپ ایسا معاشرہ نہیں دکھا سکتے مگر سوائے ایک آدھ ملک کے۔ وہاں بھی اگر کوئی جزوی سا امن و امان ہے۔ تو انہی اصولوں کی وجہ سے کہ جو طالبان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔

اعتراض یہ وحدت اُمت کا خیال ذہن سے نکال پھینکیں اُمت کو ایک جگہ جمع کرنا کیوں اتنا ضروری ہے جبکہ صدیوں سے اُمت اسی طرح مختلف ممالک کی شکل میں رہ رہی ہے۔

جواب ایسے حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ وحدت اُمت کا مسئلہ اتنا ہی ضروری اور لازمی ہے جتنا کہ پورے جسم کے تمام اعضاء کو حرکت میں لانے کے لئے صرف ایک دماغ کا سوچنا ضروری ہے۔ اگر غلطی سے کبھی دماغ کے ساتھ دل بھی کسی کام کے متعلق سوچنا شروع کر دے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ راستہ کے ہموار ہونے کے باوجود آدمی چلتے چلتے تین مرتبہ ٹھوکر کھاتا ہے۔

ایسے صاحبان کو اس بات پر کیسے قائل کیا جائے کہ یہ وحدت اُمت کا مسئلہ اتنا ہی ضروری ہے کہ جتنا گھر کے ادارے کو چلانے کے لئے گھر کا ایک ہی سربراہ ہونا لازمی ہے۔ اگر گھر کے علاوہ بھی کسی دوسرے ادارے کے آپ دو سربراہ بنائیں گے تو اس ادارے کے چلانے سے پہلے ہی اس کی اینٹیں گنی جا سکتی ہیں۔ وحدت اُمت کا مسئلہ اتنا ہی ضروری ہے کہ جس طرح ہم اپنے معاشرے میں اپنے میں سے کسی ایک کو ملک کا مختار بناتے ہیں۔ اس کام کے لئے دو شخصیات کا مختار بننا تو دور کی بات ہے۔ اگر کوئی شخص ایک کو دل سے بھی تسلیم نہ کرے تو پھر اس ملک کی وحدت جس طرح پارہ پارہ ہوتی ہے اور اس ملک کی قوم پر جیسی مصیبتیں ٹوٹتی ہیں اس کا مشاہدہ آج ہم اپنی آنکھوں سے کر سکتے ہیں۔

پھر آخری ٹھوس بات یہ کہ حدیث رسول ﷺ بھی تو اس مسئلہ کے حل کے لئے مل جاتی ہے کہ (کسی امیر کے ہوتے ہوئے اگر کوئی دوسرا امیر بنے تو اس کو قتل کر دو) گویا مسلم امہ تشکیل دینے

والے پیغمبر ﷺ نے اس اُمت کی سالمیت کے لئے ایک فرمان بھی جاری فرما دیا۔ یہاں کوئی صاحب گنجائش نکال سکتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ کب ذکر ہے کہ سب ممالک آپس میں لازماً ایک بن جائیں!

اس بات کے لئے ہمیں حدیث میں حکم کی علت کو سامنے رکھنا ہو گا اور علت یہ ہے کہ اُمت کی خیر اُمت کے یکجا رہنے میں ہے۔ تو اس کے لئے جب بھی موقع ملے وہ ضائع نہیں کرنا چاہئے یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں بھی جبکہ دو حکومتیں بن گئیں تھیں۔ دونوں حضرات کو سوچنا چاہئے تھا کہ کیا حرج ہے اس بات میں کہ دونوں حکومتیں الگ الگ چلتی رہیں لیکن نہیں۔

حضرت علیؓ نے صاف حضرت معاویہؓ سے مطالبہ کیا کہ اہل مدینہ نے مجھے خلیفہ چن لیا ہے۔ لہٰذا تم بھی میری بیعت کرو۔ اور میری امارت کو تسلیم کرو اور ہمیں معلوم ہے کہ قاتلان عثمانؓ سے نپٹنے سے پہلے حضرت علیؓ نے اس فساد کو ختم کرنے کی کوشش کی کہ جس کے نتیجے میں اُمت میں ایک امیر کی بجائے دو امیر اور دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں پھر جو اُمت میں زوال شروع ہوا اس کی الگ داستان ہے۔ اس وقت بتانا یہ مقصود ہے کہ اس حدیث مبارکہ کو سامنے رکھتے ہوئے جب بھی موقع آ جائے اس اُمت کو یکجا ہونا چاہئے جیسے کہ صحابہ کے دور میں وحدت اُمت کی کوشش

ہوئی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ایک وقت میں اسی وحدتِ اُمت کی مصلحت میں اپنی خلافت سے دستبرداری اختیار فرمائی۔

اعتراض اکثر و بیشتر یہ بات بھی سامنے آئی کہ افغانستان کے امیرالمومنین کی اطاعت اس وقت لازم ہو گی جب وہ اس اطاعت کے لئے عام اعلان کرے گا۔

جواب اس بات کی وضاحت طلب کرنے کے لئے میں اپنے کرم فرماؤں سے ایک سوال کرتا رہا ہوں اور یہ سوال اب بھی عوام و خواص کے ذمہ ہے کہ مجھے اس بات کی دلیل قرآن و حدیث' سُنّت و سیرت سے دے دیں کہ جب امیرالمومنین کہیں گے تو پھر فرض یا لازم ہو گا۔ اس سے پہلے اطاعت کیوں لازم یا فرض نہیں۔ بلکہ منطقی بات تو یوں ہے کہ جب امیرالمومنین عام اطاعت کا حکم دیں گے تو اس وقت بھی میں اپنے ملک کا باشندہ رہوں گا اور امیرالمومنین اپنے ملک کے امیر ہوں گے میرے اور ان کے درمیان کونسا رشتہ قائم ہو جو مجھے عقلی اعتبار سے بھی اور دینی اعتبار سے بھی مجبور کرے کہ جب امیرالمومنین اپنی اطاعت کے لئے اعلان کرے تو میں ان کے حکم کی اطاعت کروں وہ رشتہ یہی سمع و طاعت کا رشتہ ہے جس کی دعوت میں دے رہا ہوں ہاں اس رشتہ میں بندھ جانے کے بعد پھر امیرالمومنین جب کہیں گے پھر ان کی اطاعت لازم ہو گی۔ پھر اگر وہ حکم دیں کہ اپنا ملک چھوڑ کر افغانستان آ جاؤ تو پھر اطاعت فرض ہو گی

لیکن اس سمع و طاعت کے عہد کے بغیر میرے سامنے کوئی دلیل قرآن و سُنّت سے نہیں آ سکی جس کو سامنے رکھ کر کہا جائے کہ کسی کی امارت قبول کئے بغیر کوئی خلیفۃ المسلمین پہلے مطالبہ کریں گے تو پھر ان کو ماننا فرض ہو گا یا ان کی اطاعت فرض ہو گی۔

اعتراض اگر تمام مسلم ممالک افغانستان کے امیر کی اطاعت کا عہد کرلیں تو پھر باہم معاملات کیسے چلیں گے؟

جواب یہ بڑا دلچسپ اعتراض ہے اور اس کا جواب اس اعتبار سے بڑا اہم ہے کہ اگر پوری اُمت یا اکثر و بیشتر ممالک افغانستان کے امیرالمومنین کی اطاعت قبول کرلیں اور ان ممالک کے سربراہوں کے دلوں میں اللہ موجودہ اُمت مسلمہ کی ذلت و رسوائی کے پیش نظر وحدت اُمت کی اہمیت کو اجاگر فرما دے تو پھر ان ملکی حدود کو قائم رکھتے ہوئے ایک ہی امیر کی اطاعت کا نظام کس طرح قائم ہو گا۔ آیا اس صورت حال میں یہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔

واقعتاً آج کی متمدن دنیا جن حدود کو چھو رہی ہے۔ ؏

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

کے مصداق سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان ستاروں کی گزرگاہوں کا مسافر بن گیا ہے۔ جہاں ایک طرف انسان دنیا کو اس طرح مسخر کرتا جا رہا ہے۔ وہاں اسی ترقی اور تمدن نے ہم کو ایسے ذرائع ابلاغ سے مسلح کیا ہے کہ دنیا کے ایک سرے پر بیٹھ کر دوسرے سرے پر بیٹھے آدمی سے ایک شخص اظہار خیال کر

سکتا ہے۔

پوری اُمت کو ایک امیر کی اطاعت کرنے میں اور اس کے بعد آپس میں معاملات کو چلانے میں اب پہلے کی نسبت زیادہ آسانی ہو گئی ہے۔ کیونکہ پہلے ذرائع رسل و رسائل اور ذرائع ابلاغ اس قدر ترقی یافتہ نہیں تھے۔ امیر کی اطاعت جیسے پہلے تھی ویسے ہی آج اصولی اعتبار سے ہر ملک یا ہر ریاست اپنے اوپر لازم سمجھے اور باقی اپنے ملکی معاملات کسی ملک کے تمدنی اعتبار سے جس سطح پر ہیں اسی سطح پر چلتے رہیں اِلاّ یہ کہ کوئی معاملہ اسلام کے خلاف ہو اسے ختم کرنا ہوگا کیونکہ اصولی اعتبار سے سمع و طاعت فی المعروف کا عہد کیا ہوا ہوگا اور امیر کی اطاعت مقدم رہے گی۔ اس طرز عمل کے ضمن میں بہت سے سوالات جنم لیں گے۔ جتنا گھمبیر مسئلہ ہے مجھے معلوم ہے اس کے لئے جو اصولی راہ نمائی ہونی چاہئے اس کی طرف میں نے اپنی فکری اور دینی استعداد کے مطابق اشارہ کر دیا ہے کہ اصولی اعتبار سے بالادست حکم اسی ایک امیر کا ہوگا باقی اپنے ملکی معاملات اپنی اپنی روایات کے مطابق چلتے رہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں مگر جو روایت اسلام کے خلاف ہوگی اس کو ختم کرنا ہوگا۔

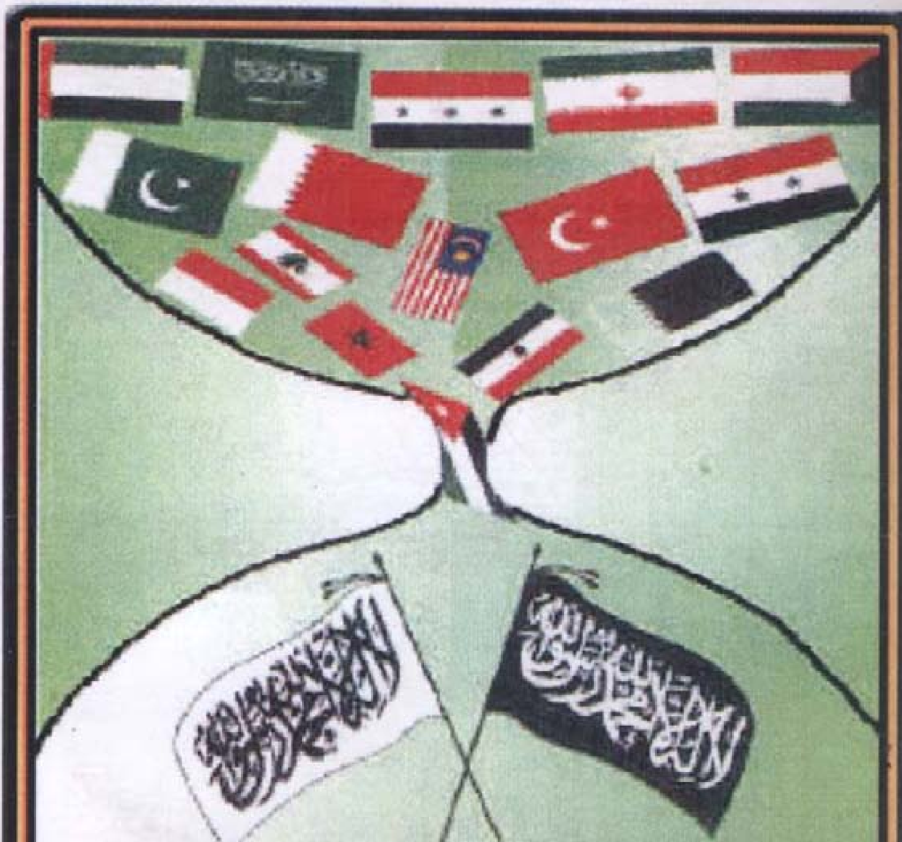
باقی یہ معاملہ ابھی غور طلب رہے گا ملک کے دانشور حضرات کو اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اپنے قیمتی وقت کی قربانی دینا ہوگی اور اس کے حل کے لئے سوچنا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ میری یہ تجویز ان حضرات کے لئے ہے۔ جو اُمت کی

موجودہ صورت حال کے پیش نظر وحدت اُمت کے لئے دعاگو رہتے ہیں نہ کہ ان کے لئے کہ جو

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

کے مصداق اب بھی اپنے اپنے ملکوں کو غلبہٗ دین کے لئے ترجیح دے رہے ہیں۔



ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ